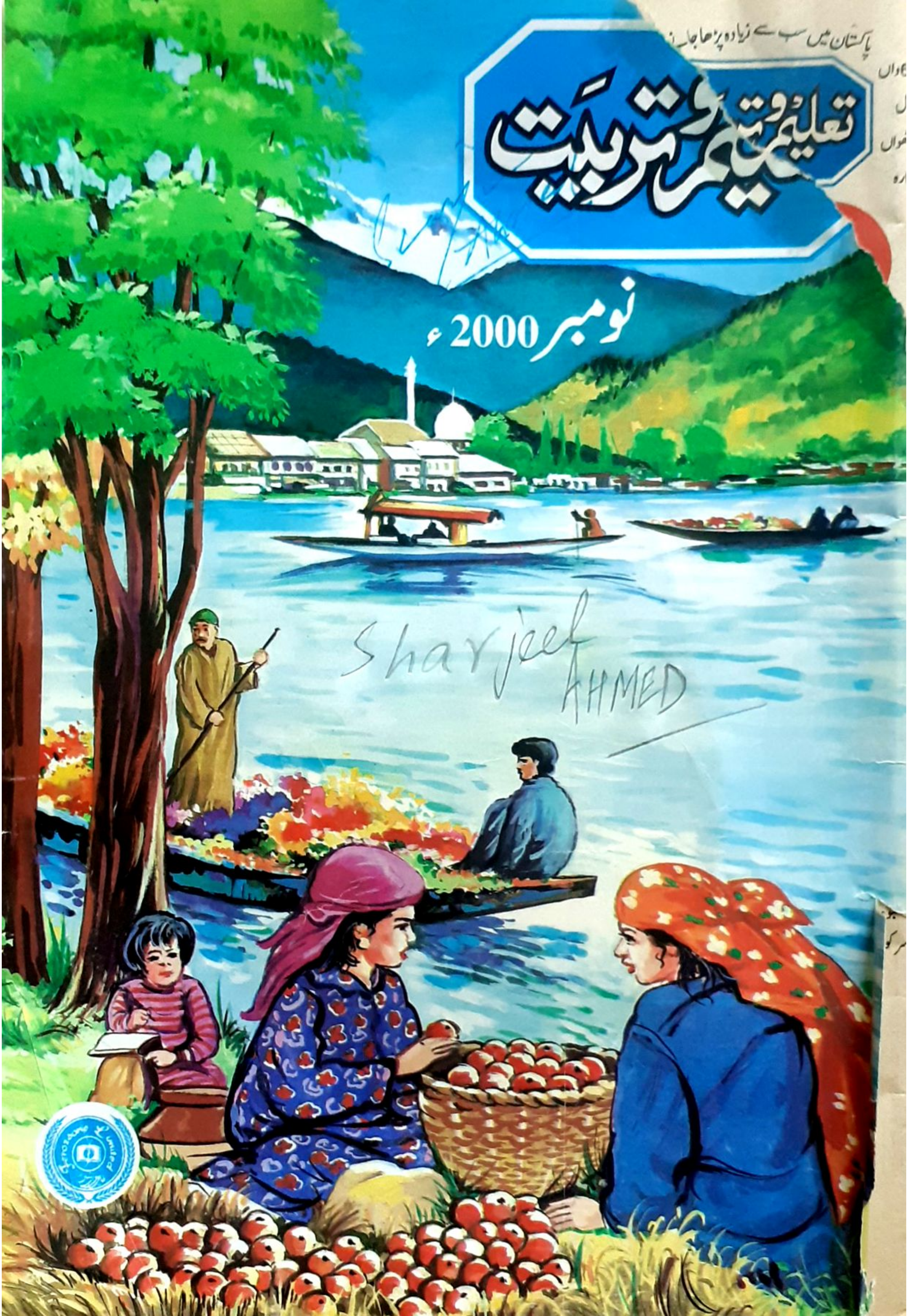
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے
تعلیم و تربیت
نومبر 2000ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	مشیر	سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر	خصوصی مشیر	اسپیشلسٹ ڈیزائننگ	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	سعید لخت	رضوان ثاقب	محمود حسن رومی	شوکت اعجاز	محمد بشیر راہی

نا بھئی نہ

اب اندھیر سویر والا چکر ختم! اس سال کا آخری شمارہ بھی ان شاءاللہ مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسا زبردست کہ آپ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ آج ہی اپنے قریبی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی محفوظ کروالیجیے ورنہ یہ نہ ہو کہ آپ لینے جائیں تو یہ جواب ملے "جی' پہلے تو یہ یکم تاریخ تک آتا ہی نہیں تھا مگر اب یکم تک نکتا ہی نہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

آج سے 123 سال پہلے 9 نومبر 1877ء کو ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور اسے خودی یعنی خود اعتمادی کا سبق دیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے کلام کو سمجھیں اور اس پر سچے دل سے عمل کریں۔

نومبر کے آخری دنوں میں رمضان کا بابرکت مہینا شروع ہو رہا ہے۔ لیکن اس شمارے میں رمضان المبارک سے متعلق تحاریر شائع نہیں کی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تو آپ کو دسمبر کا شمارہ بھی مل گیا ہوگا۔ اس لیے اس مناسبت سے مہینے کے اچھی اچھی تحریریں ان شاءاللہ دسمبر کے شمارے میں ہی شائع کی جائیں گی۔

سردی کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ اس موسم میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھیں۔ باہر نکلتے وقت کوٹ' سوئیٹر مفلر یا دیگر گرم کپڑوں سے اپنے آپ کو لپیٹ لیں۔

بہت سارے ساتھیوں نے بروقت شمارہ موصول ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ہماری یہ بھرپور کوشش ہوگی کہ تعلیم و تربیت کا ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہو اور مہینا شروع ہونے سے پہلے ہی آپ کے ہاتھوں میں بھی ہو۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اپنے محبوب رسالے سے اپنے کتنے دوستوں اور عزیزوں کو متعارف کرواتے ہیں۔ ایڈیٹر

نومبر 2000ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

سرورق: کشمیر کی کہانی

...ر: عبدالسلام

...عہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

...لیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
علامہ اقبال (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء	2
ایمان کی دولت (سچی کہانی)	سید نظر زیدی	3
کشمیر کی کہانی	ڈاکٹر رضوان ثاقب	7
آزادی خطرے (کہانی)	آر ایم راہی	11
کہہ کا ہو (کہانی)	حامد مشہود	19
چاچو چاند ہوئے اغوا (کہانی)	محمد معروف چشتی	24
نیپال (معلومات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	28
نیپال کے آدم خور (کہانی)	سلیم خان گمی	30
کرکٹ کیا اور کیسے؟ (13)	ابن الطاف	34
جھیلو جھیلو جھیلو (کہانی)	نجمہ معراج	38
آیئے مسکرائیں (لطائف)		44
پھول بستی (سائنس فکشن)	حسن ذکی کاظمی	45
آپ کا خط ملا		49
وہیل اور ڈولفن (جنگلی حیات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	52
آپ بھی لکھیے		54
مجرم کون؟		59
آیئے دوست بنائیں		60
سردی کا موسم (نظم)	افضال عاجز	61
گھوڑے تصویر ہیں (کارٹون کہانی)	شاہد ریاض شاہد	62
گڑھے میں لاش (قسط 6)	اشتیاق احمد	64

باقی سب دلچسپ سلسلے حسب معمول

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے — مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے

یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے — امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور

فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

علامہ اقبال

ضیاء الحسن ضیاء

ہے انوکھی شاعری اقبال کی
قدر کرتے ہیں سبھی اقبال کی

قومی شاعر ، فلسفی اقبال تھے
وجہ شہرت ہے خودی اقبال کی

قابلِ تقلید ہے سب کے لئے
سادہ لوحی ، سادگی اقبال کی

شاعرِ مشرق بھی کہتے ہیں اُنہیں
سب نے مانی آگہی اقبال کی

فکرِ اسلامی سے تھی آراستہ
آئینہ ہے راستی اقبال کی

سرورِ دیںؐ سے محبت تھی اُنہیں
ہے مثالی عاشقی اقبال کی

تھی محبت کا نمونہ اے ضیا
جتنی گزری زندگی اقبال کی

سید نظر زیدی

ایمان کی دولت

وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی۔ بیٹا بھی تو ماشاء اللہ ایسا ہی تھا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب' ایسا خوب صورت کہ جو دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔ جب وہ عطر میں بسا ہوا ریشمی لباس پہن کر نکلتا تو کسی ملک کا شہزادہ لگتا۔ اچھی صورت کے ساتھ اللہ نے اسے قابلیت بھی بہت دی تھی۔ وہ عقل مند ہونے کے ساتھ بہادر بھی تھا۔ تمیز دار ایسا کہ غریبوں سے بھی جھک کر ملتا تھا۔ آدمی میں اتنی ساری خوبیاں ہوں تو وہ غیروں کو بھی اچھا لگتا ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے ماں کی محبت نفرت اور غصے میں بدلی ہوئی لگتی تھی۔ وہ بیٹے کو دیکھتی تو بہت ناراض ہو کر کہتی۔ ''لڑکے' تو کیوں اپنی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ یاد رکھ اگر اپنی ضد نہ چھوڑی تو میں تجھے اپنے گھر سے نکال دوں گی۔ تیرا یہ قیمتی لباس چھین لوں گی۔ اپنی جائیداد سے محروم کر دوں گی اور پھر تو در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا!''

بیٹا ماں کی یہ غصے بھری باتیں تحمل سے سنتا اور پھر سمجھانے کے انداز میں کہتا ''امی جان' آخر آپ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتیں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ میں تو برائی سے بھلائی اور اندھیرے سے روشنی کی طرف آیا ہوں۔ آپ جسے اپنا دین کہتی ہیں یہ تو نری جہالت ہے۔ سوچئے تو کیا یہ بت ہمارے حاجت روا ہو سکتے ہیں جنہیں ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں؟ اور کیا یہ بے انصافی اور ظلم انسان کی شان کے مطابق ہے جسے ہمارے چھوٹے بڑے اپنائے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں' جو کام انسان کی شان اور مرتبے کے مطابق ہے وہ تو یہ ہے کہ صرف سچے خدا کی عبادت کرے۔ کسی کو بھی اس کا شریک نہ بنائے۔ کمزوروں کا ساتھ دے۔ ان کی مدد کرے اور ظالموں کا زور توڑے اور میں نے جو دین اختیار کیا ہے اس نے ایسا ہی بننے کا حکم دیا ہے''۔

اوپر کی سطروں میں جو باتیں لکھی گئی ہیں یہ اندازہ کر کے لکھی گئی ہیں کہ ان ماں بیٹے میں ایسی ہی گفت گو ہوتی ہو گی۔ ماں اپنے پرانے مذہب پر لوٹ آنے کی ضد کرتی ہو گی اور بیٹا اپنے نئے دین کی اچھائیاں بیان کرتا ہو گا۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ جب بیٹے نے کسی طرح بھی ماں کی بات نہ مانی اور صاف لفظوں میں کہ دیا کہ میں اپنے نئے دین پر قائم رہوں گا تو ماں نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ کہا: ''تو پھر تو میرے گھر سے نکل جا۔ جو قیمتی لباس تو نے پہن رکھا ہے اتار دے کیوں کہ یہ میں نے بنوا کر دیا ہے اور انہی لوگوں میں چلا جا جن کے بہکاوے میں آکر تو نے اپنے بزرگوں کا دین چھوڑا ہے''۔

بچے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کیسا خوف ناک فیصلہ تھا۔ لیکن اپنے نئے دین اسلام کی محبت میں اس مومن بیٹے نے خوشی سے یہ فیصلہ مان لیا۔ بڑھیا لباس اتار دیا اور کمبل کا ایک ٹکڑا جسم سے لپیٹ کر گھر سے نکل آیا۔

عزیز بچو! جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ وہ زمانہ اسلام قبول کرنے والوں کے لیے مصیبتوں سے بھرا ہوا تھا۔ خود اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ دکھوں اور پریشانیوں سے بھری ہوئی زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ آپؐ کا تعلق شہر مکہ کے سب سے معزز خاندان بنی ہاشم سے تھا' لیکن دشمن آپؐ کو بھی طرح طرح سے ستاتے تھے۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے تھے۔ آپؐ کے اوپر کوڑا کرکٹ پھینک دیتے تھے۔ آپؐ کا مذاق

اڑاتے تھے۔ غریب مسلمانوں کے ساتھ وہ کیا برا سلوک کرتے تھے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ وہ نماز بھی چھپ کر پڑھتے تھے۔ ایک صحابی حضرت ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں سب اکٹھے ہو جاتے اور وہیں نمازیں ادا کرتے۔ اسلامی تاریخ میں اس گھر کو دارارقم لکھا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی وہاں آجاتے تھے۔

یہ نوجوان گھر سے نکل کر دارارقم پہنچا تو اللہ کے رسول ﷺ وہاں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے اسے اس حالت میں دیکھا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرمایا "ہم نے اس نوجوان کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ مکہ میں اس سے اچھا لباس پہنے والا کوئی نہ تھا لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں آج اس کی یہ حالت ہے"۔

ہمارا خیال ہے اب اس نوجوان کا نام بتا دیا جائے جو اللہ کے لیے ہر طرح کی مصیبتیں سہنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اس کا نام ہے مصعب بن عمیر بن ہاشم۔ وہ مکہ شہر کے خوش حال قبیلے

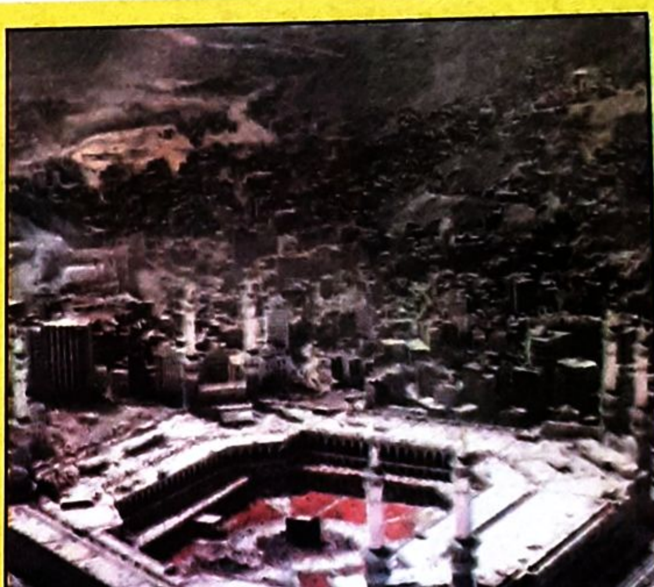

مکہ معظمہ کا ایک
دلکش منظر

عبدالدار میں پیدا ہوا تھا اور اپنی خوب صورتی اور خوش پوشاکی کی وجہ سے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' لیکن اب وہی رئیس زادہ غریبوں میں بھی سب سے زیادہ غریب بن گیا تھا۔

کافروں نے جب مسلمانوں کو بہت زیادہ ستانا شروع کر دیا تو رسول ﷺ نے اللہ کے حکم سے انہیں شہر مکہ چھوڑ کر ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ مسلمانوں نے یہ ہجرت تین بار کی۔ دو بار ملک حبشہ گئے جسے ان دنوں ایتھوپیا کہا جاتا ہے اور آخری بار مدینہ منورہ۔ اس نوجوان نے تینوں بار ہجرت کی اور یہ سفر اختیار کرتے ہوئے اسے بہت ہی سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ہجرت کے سفر پر روانہ ہونے لگا تو اس کی بیوی نے بھی اس کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن روانگی کے وقت اس کے سسرال کے قبیلے والے آگئے اور کہا "اگر تو مکہ چھوڑ کر جا رہا ہے تو شوق سے چلا جا لیکن ہم اپنی بیٹی کو نہ جانے دیں گے"۔ یہ کہ کر انہوں نے اس کی بیوی کو روک لیا۔ وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ بیوی کا جدا ہو جانا معمولی بات نہ تھی کہ اسی وقت اسے ایک صدمہ اور اٹھانا پڑا۔ بیوی کے رشتہ دار اسے اپنے ساتھ لے جانے لگے تو اب اس کے اپنے قبیلے عبدالدار کے لوگ آگے بڑھے اور اس کی بیوی سے اس کے بچے کو یہ کہ کر چھین لیا کہ تم اپنی بیٹی کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ لیکن ہم اپنے بیٹے کی اولاد کو تمہارے قبضے میں نہ دیں گے۔ یوں ذرا سی دیر میں اس کا چھوٹا سا خاندان تین حصوں میں بٹ گیا۔

یہ بہت بڑی آزمائش تھی' کوئی معمولی آدمی ہوتا تو ضرور ڈگمگا جاتا۔ لیکن آپؓ نے اپنے دین کی محبت میں یہ بہت بڑا صدمہ ہنسی خوشی برداشت کیا اور اس قربانی کے بدلے اللہ نے آپؓ کا درجہ اتنا بلند کر دیا کہ رسول ﷺ نے انہیں اپنے عزیز ترین صحابیوں میں شامل کر لیا۔ پہلی عزت تو آپؓ کو یہ بخشی کہ مدینہ کے رہنے والے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا انہیں دین کی تعلیم دینے پر مقرر کیا۔ اس کے بعد 2 ہجری اور 3 ہجری میں ہونے والے غزوہ بدر اور غزوہ احد میں علم بردار بنایا اور یہ ایسی عزت تھی کہ بہت اونچے درجے کے صحابہ کے حصے ہی میں آئی تھی۔

غزوہ بدر میں رسول ﷺ نے اسے مہاجرین کا علم عنایت فرمایا اور غزوہ احد میں پورے اسلامی لشکر کا۔ اس زمانے کی جنگوں میں علم یعنی جھنڈے کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا تھا۔ اگر کسی لشکر کا علم جھک جاتا یا گر جاتا تھا تو اسے اس کی شکست کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے علم بردار انہی لوگوں کو بنایا جاتا تھا جو بہت بہادر ہونے کے ساتھ پوری طرح وفادار اور ایمان دار بھی ہوتے تھے۔ رسول ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو دو بار علم بردار بنایا تو اس کا مطلب ہے آپ ﷺ کو ان پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس منصب کا اس طرح حق ادا کیا کہ دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

غزوہ بدر میں تو اللہ پاک نے مسلمانوں کو شان دار فتح سے نوازا تھا لیکن غزوہ احد میں ایک موقع ایسا آیا کہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ یہ صورت حال ان تیر اندازوں کی وجہ سے پیدا ہوئی جنہیں رسول ﷺ نے پہاڑ کی گھاٹی میں بٹھایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ کافر شکست کھا کر بھاگنے لگے تو ان تیر اندازوں نے مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کافروں نے گھاٹی خالی دیکھی تو پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ اور کئی اور اونچے درجے کے صحابی شہید ہو گئے۔ خود رسول ﷺ کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ آپؐ سخت زخمی ہو گئے۔

اس بہت ہی نازک موقع پر حضرت مصعب بن عمیرؓ نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ دونوں ہاتھ کٹ جانے کے باوجود اسلامی لشکر کے علم کو زمین پر نہ گرنے دیا۔ اپنے کٹے ہوئے بازوؤں ہی میں اس وقت تک سنبھالے رکھا جب تک ایک اور مجاہد نے اسے سنبھال نہ لیا۔ آپؓ نے اس جنگ میں شہادت کا درجہ پایا۔ غزوہ احد کے شہیدوں میں آپؓ کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ رسول ﷺ آپؓ کی میت پر تشریف لائے اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

”میں نے مکہ میں تم جیسا خوب صورت اور اچھا لباس پہننے والا کوئی نہ دیکھا تھا لیکن آج دیکھتا ہوں کہ تمہارے بال گرد میں اٹے ہوئے اور الجھے ہوئے ہیں اور تمہارے بدن پر صرف ایک چادر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ قیامت کے دن تم اللہ کی بارگاہ میں عزت کے ساتھ حاضر ہو گے“۔

ایمان اور اسلام کے سلسلے میں ہمارا حال یہ ہے کہ بغیر کوشش اور خواہش کے یہ گوہر شب چراغ ہمیں مل گیا ہے۔ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے اس لیے مسلمان ہیں۔ ایمان کتنی بڑی دولت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں حضرت مصعب بن عمیرؓ اور دوسرے بزرگوں کے ایثار اور قربانیوں پر غور کرنا چاہیے کہ انہوں نے مسلمان ہونے کی عزت حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں۔

بچوں کے لیے

درس قرآن

اللہ کا پسندیدہ مذہب

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کے لیے درس قرآن میں اس دفعہ ہمارا موضوع ہے: ''اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ مذہب ہے''۔

موضوع کی مختصر وضاحت تیسری سورت کی انیسویں آیت کے ان ابتدائی الفاظ میں ہوئی ہے۔

ان الدین عنداللہ الاسلام

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذہب صرف اسلام ہی ہے۔

کسی مذہب کی پابندی کے بغیر انسانی زندگی نامکمل سی رہتی ہے۔ ہماری کائنات میں متعدد مذاہب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایک ایسے نظام فکر بھی نظر آتے ہیں جن میں کسی خاص انسانی ضرورت کو سامنے رکھ کر ہدایت نامے وضع کیے گئے ہیں۔ انسانوں کی ایک خاصی تعداد ایسی بھی نظر آتی ہے جو نہ تو کسی مذہب اور نہ ہی کسی مخصوص دنیاوی نظام فکر کی پابند معلوم ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی مذہب کی ضرورت ہر وقت محسوس ہوتی ہے۔ مذہب پر ایمان سے انسان میں اپنی زندگی سنوارنے کی سوچ اور دوسروں کی اصلاح کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی مفید سوچ اور خوش گوار عمل سے انسانی زندگی میں تعمیر و ترقی کے نئے نئے میدان سامنے آتے ہیں۔

دنیا کے کئی مذہبوں نے انسان کو بدی سے بچانے اور نیکی پر مائل کرنے کے لیے بڑی تعمیری خدمات سر انجام دی ہیں۔ مگر یہ حقیقت دنیا بھر میں مان لی گئی ہے کہ انسانوں کی رہ نمائی اور ترقی کے کام میں اسلام کا مقام سب سے بلند و تر ہے۔ اسلام نے دنیا کو ہر قسم کی برائیوں سے بچنے اور نیکیاں کرنے کی نہایت موثر اور کام یاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلام دنیا کا مہذب ترین اور پسندیدہ ترین مذہب ہے۔ یہی وہ واحد مذہب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کی رہ نمائی اور ترقی کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

* * *

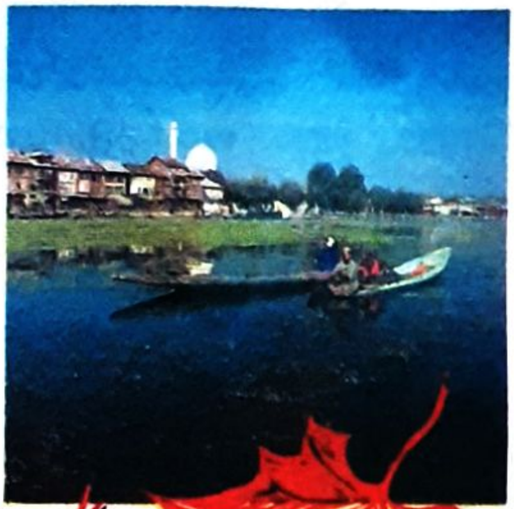

کشمیر کی کہانی

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ریاست جموں و کشمیر برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمال اور جنوبی ایشیاء کے عین وسط میں واقع ہے۔ ریاست کے مشرق میں چینی تبت ' مغرب میں پاکستان ' شمال میں چین ' روس اور افغانستان ' جنوب میں کچھ حصہ پاکستان اور مختصر سا حصہ بھارت کا واقعہ ہے۔ ریاست کا کل رقبہ 86064 مربع میل ہے۔ جس میں سے 50513 مربع میل رقبے پر بھارت نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر دنیا کے 110 آزاد ممالک سے بڑی ہے۔ جموں و کشمیر کی کل آبادی کا تخمینہ ایک کروڑ 34 لاکھ لگایا گیا ہے۔ جس میں سے ہندوستانی مقبوضہ علاقہ میں 80 لاکھ ' آزاد کشمیر گلگت بلتستان 33 لاکھ ' مہاجرین جموں و کشمیر مقیم پاکستان 15 لاکھ ' برطانیہ میں مقیم کشمیری 3 لاکھ ' امریکا ' عرب ممالک اور دوسرے ممالک میں آباد کشمیری 11 لاکھ ہیں۔ بھارت کے زیر قبضہ جموں کشمیر کے علاقہ کے تین صوبے ' جموں کشمیر اور لداخ ہیں۔

دنیا کی سب سے خوب صورت سب سے بلند اور مشہور وادی "وادی کشمیر" اسی ریاست میں ہے۔ یہ حسین ترین وادی 84 میل لمبی اور 35 میل کے لگ بھگ چوڑی ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں بہت سی مشہور وادیاں ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں بے شمار حسین باغات ہیں۔ شالا مار باغ جھیل ڈل کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ جو نہروں ' پھولوں ' بارہ دریوں اور فواروں کی وجہ سے انتہائی خوب صورت ہے۔ نسیم باغ میں چناروں کے بہترین درخت ہیں۔ یہاں بہت سی جھیلیں بھی ہیں۔ ان میں ڈل جھیل سب سے خوب صورت ہے جو سری نگر کے قریب پہاڑوں میں واقع ہے۔ دو ننھے ننھے جزیرے روپ لنکا اور سونا لنکا اس کے قدرتی حسن کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ریاست میں بے شمار چشمے بھی ہیں۔ ان میں چشمہ اننت ناگ کا پانی گرم اور گندھک ملا ہوتا ہے جو جلدی بیماریوں کے لیے اکسیر ہے۔ چشمہ "تتہ پانی" کا پانی بھی جلدی امراض اور جوڑوں کے درد کے لیے شفا بخش ہے۔ چشمہ شاہی کا پانی اس قدر نفیس ہے کہ بوتلوں میں بھر کر باہر بھیجا جاتا ہے۔

وادی کشمیر جو ریاست جموں و کشمیر کی سب سے حسین اور سب سے بڑی وادی ہے اس کے ارد گرد پہاڑوں کا وسیع سلسلہ ہے۔ دنیا کا سب سے بلند پہاڑی سلسلہ کوہ ہمالیہ ہے جس کے دامن میں خطہ کشمیر آباد ہے۔

کشمیر کے تقریباً 11000 مربع میل علاقے پر جنگلات ہیں جن میں مشہور درخت دیودار ' چیل ' نیندر اور پاپولر وغیرہ کے ہیں۔

اس ریاست کے بڑے دریاؤں کی تعداد 8 ہے اور 36 ان کے چھوٹے معاون دریا ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کو اس لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے کہ اس کی تاریخ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے کی ہے۔ اڑھائی ہزار قبل مسیح سے 1324ء تک کا

دور ہندو راجاؤں کا دور ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں یہاں مسلمان درویشوں اور صوفیوں کی آمد کے سلسلہ میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب ہندو حکم ران طبقہ اخلاقی' معاشرتی اور سیاسی طور پر زوال پذیر ہو چکا تھا اور اب وادی کشمیر کے عوام کو اسلام کی صورت میں ایک بہترین متبادل میسر آ گیا۔ لہٰذا یہاں اسلام کا خوب فروغ ہوا۔

کشمیر 1586ء سے 1772ء تک' 166 سال تک مغل سلطنت کا صوبہ رہا۔ کشمیر میں باغات' عمارات اور دیگر تعمیر و ترقی کے جتنے کام اس مغل دور میں ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد کشمیر کے چند امراء نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس طرح 1752ء میں افغانوں نے کشمیر پر قبضہ کر لیا جو 1819ء تک جاری رہا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ 1813 میں کابل کے حکم ران محمود شاہ نے پنجاب کے حاکم رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر کشمیر پر حملہ کر دیا تھا۔ جس کے لیے یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ کام یابی کی صورت میں رنجیت سنگھ کو 8 لاکھ روپے دیئے جائیں گے مگر کام یابی کے بعد افغانوں نے یہ کہ کر رقم دینے سے انکار کر دیا کہ سکھوں نے صحیح طرح مدد نہیں کی۔ رنجیت سنگھ نے 8 لاکھ روپے کی وصولی کا بہانہ بنا کر 1814ء میں کشمیر پر حملہ کر دیا لیکن شکست سے دوچار ہوا۔ 1819ء میں افغان خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رنجیت سنگھ نے ایک بار پھر کشمیر پر حملہ کر دیا اور یوں وادی کشمیر سکھوں کے قبضے میں چلی گئی۔

وادی کشمیر پر سکھوں کے تسلط کے دور (1819-1846) میں یہاں دس گورنر مقرر ہوئے۔ جن کے مظالم سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ 1846ء میں سکھوں نے کشمیر انگریزوں کے حوالے کر دیا اور سکھوں کے اقتدار کو رو بہ زوال دیکھ کر جموں کے ایک بااثر جاگیر دار گلاب سنگھ ڈوگرہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے تاوان جنگ کے طور پر اونے پونے داموں کشمیر کو خرید لیا۔ یوں دنیا کے خوب صورت ترین خطہ جموں و کشمیر کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک جاری ہے۔

کشمیر میں آزادی کی تحریک کا آغاز 29 اپریل 1931ء کو جموں میونسپل کمیٹی کے باغ میں عیدالاضحی کے موقع پر ہوا جب مسلمانان جموں نماز عید ادا کرنے عید گاہ میں آئے۔ امام صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان بیان کر رہے تھے۔ ڈوگرہ ڈی آئی جی رام چند کو گمان گزرا کہ فرعون کے نام سے دراصل ڈوگرہ حکم ران ہری سنگھ پر تنقید کی جا رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر انسپکٹر کھیم چند کو حکم دیا کہ وہ عید گاہ میں داخل ہو کر امام کو خطبہ بند کرنے کا حکم دے۔ اس نے نہایت غصیلے انداز میں کہا۔ "خطبہ بند کیجئے آپ قانون کی حدود کو پھاند رہے ہیں اور جرم بغاوت کے مرتکب ہو رہے ہیں"۔

حال آں کہ عید کی نماز کے ساتھ خطبہ پڑھنا مذہبی فریضہ اور عید کی نماز کا حصہ ہے۔ لہٰذا خطبے کی بندش کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس حکم سے نمازیوں کے جذبات واحساسات میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا۔ وہ سراپا احتجاج بن کر ڈوگرہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ احتجاج کی لہر جموں و کشمیر کی پہاڑیوں سے نکل کر پوری ریاست میں پھیل گئی۔

اس احتجاج میں اس وقت اور بھی شدت آ گئی جب جولائی 1931ء میں سری نگر میں بادام واری کے مقام پر ظہر کے وقت ایک مسلمان نوجوان نے دیوار پر کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کی تو پولیس نے گولی چلا دی۔ مسلمان نوجوان شہید ہو کر گر پڑا۔ اذان مکمل کرنے کے لیے دوسرا نوجوان آگے بڑھا تو اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ اس طرح اذان کی تکمیل تک 21 نوجوان شہید ہو گئے جب کہ 5 شدید زخمی ہو گئے جو بعد میں شہید ہو گئے۔ ان میں سے ایک دم توڑتے ہوئے نوجوان نے اہل وطن کے لیے یہ لازوال پیغام چھوڑا۔

"بے گناہوں کا خون ناحق رائیگاں نہ ہونے پائے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب کشمیر کی قسمت تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جھوٹی چمک دیکھ کر اپنے فرائض اور حق و صداقت کے بلند مقاصد کو بھول کر ذاتی مفاد کے لیے

ایک دوسرے کے سر پھوڑنے لگو۔ اس مادر وطن کو ضرورت پڑنے پر اپنے خون سے لالہ زار بنانے سے دریغ نہ کرنا"۔

ان شہادتوں کے بعد ایک ہجوم نے پولیس گارڈ پر حملہ کر دیا اور ان سے وہ چارپائیاں چھین لیں جن پر شہدا اور زخمیوں کو اٹھایا گیا تھا۔ اس بے گناہ وحشت ناک قتل عام کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام شہر میں ہی نہیں بلکہ وادی کے کونے کونے میں پھیل گئی اور پوری ریاست ماتم کدہ بن گئی۔ تمام دکانیں بند ہو گئیں۔ سارا کاروبار معطل ہو کر رہ گیا۔ لوگ جوق در جوق جامع مسجد پہنچنا شروع ہو گئے۔ حکومت نے فوج کو ہدایت کر دی کہ وہ شہدا کو مسلمانوں سے چھین لے۔ چناں ملہ کھاہ کے مقام پر مسلمانوں اور فوج کے درمیان تصادم ہوا لیکن فوج اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکی اور جلوس شہدا کو لے کر جامع مسجد پہنچ گیا۔ جامع مسجد کے وسیع و عریض صحن کے علاوہ بیرونی میدان بھی مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

جب چند مسلمان عبدالخالق شہید کی میت کو لے کر ان کے مکان واقع واذہ پورہ اور دوسری چارپائی پر ایک زخمی کو طبی امداد کے لیے مہاراج گنج ہسپتال لا رہے تھے تو مہاراج گنج کے ہندو دکان داروں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصادم پیدا ہو گیا۔ اس پر بجائے ہندوؤں کی باز پرس کرنے کے فوج نے مسلمانوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ عام گرفتاریوں کا یہ عالم تھا کہ جو مسلمان روز مرہ کا سودا سلف خریدنے کی غرض سے بازاروں میں موجود تھے ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا مگر اس کے باوجود جامع مسجد کے اندر ہی تابوت کی تیاری شروع ہو گئی۔ پھر جونہی شہدا کے تابوت جامع مسجد کے بیرونی صحن میں رکھے گئے مسلمانوں کا ایک بے پناہ ہجوم جمع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر حکومت گھبرا گئی اور ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے ایک بار پھر جامع مسجد کی دیواروں کو گولیوں کا نشانہ بنانا پڑا۔ مگر لوگوں میں سر فروشی اور جاں نثاری کا جذبہ دیدنی تھا۔ جلوس بڑی شان و شوکت سے مزار شہدا کی طرف روانہ ہوا جو درگاہ نقش بند میں بنایا گیا تھا۔ جنگ احد کے شہیدوں کی طرح شہدائے آزادی کو قبروں میں دو دو کر کے سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد وادی میں 19 دن تک ہڑتال رہی۔ 13 جولائی 1931ء کے شہدا نے اپنے خون سے جدوجہد آزادی کا جو چراغ روشن کیا اس کی روشنی ساری ریاست میں پھیل گئی اور یہ تحریک اب 69 سال گزر جانے کے باوجود بھی اسی آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

مجاہدین کی کام یاب ترین کارروائیوں سے بھارت کی حکومت اب شدید بوکھلاہٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ معروف بھارتی خاتون صحافی لولین سنگھ کشمیر کے بارے میں اپنے تفصیلی تاثرات قلم بند کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ میں کئی سال سے کشمیر کی رپورٹنگ کر رہی ہوں مگر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ کشمیر ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں تعینات 7 لاکھ فوج کے 15 ویں کور کمانڈر جرنیل کرشن پال نے کشمیر میں جاری تحریک آزادی کے حوالے سے ٹائمز آف انڈیا کو ایک انٹرویو میں اعتراف کیا ہے کہ "کشمیر میں بغاوت کو دبانا فوج کے بس کی بات نہیں۔ عسکریت پسندوں کو مار دینے سے عسکریت ختم نہیں ہو گی۔ کشمیری عوام کے دل ہندوستان کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں"۔

اب تک کی کشمیر کی یہ کہانی پڑھ کر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر کشمیر کا پاکستان کے ساتھ ہی الحاق کیوں ضروری ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب تک کشمیر پاکستان میں شامل نہیں ہوتا اس وقت لفظ پاکستان ہی مکمل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کے لفظ کی تشکیل کے وقت بھی کشمیر کے پاکستان میں شامل ہونے کا واضح تصور مسلمانوں کے ذہن میں موجود تھا۔ لفظ پاکستان میں "ک" کا حرف کشمیر کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کے بغیر پاکستان "پاستان" رہ جاتا ہے یعنی کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل بلکہ بے معنی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہے اس لیے پاک و ہند کی تقسیم کے اصولوں کے پیش نظر اس کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے جس کی زراعت کا

سارا انحصار کشمیر سے آنے والے پانی پر ہے۔ اگر خدانخواستہ واقعی کشمیر کے دریاؤں سے محروم ہونا پڑا تو پاکستان نہ صرف بنجر ہو جائے گا بلکہ ریگستان میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر اگر خدانخواستہ بھارت کے پاس چلا جائے تو بھارت دریاؤں کے پانی کو روک کر پاکستان کو ترسا بھی سکتا ہے اور جب چاہے پانی کو چھوڑ کر ڈبو بھی سکتا ہے۔ کشمیر کے پاکستان سے خدانخواستہ ملحق نہ ہونے کی صورت میں اسلام آباد اور کہوٹہ پلانٹ براہ راست بھارتی آرٹلری کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس لیے پاکستان دفاعی اعتبار سے مضبوط اور توانا تب ہی ہو سکتا ہے جب کشمیر پاکستان میں شامل ہو جائے۔

کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق خود کشمیر کے لیے بھی بہت ضروری اور ناگزیر ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں کی طرح بڑی بڑی شاہراہیں ریاست جموں وکشمیر کو پنجاب کے اس حصے سے ملاتی ہیں جو اب پاکستان کا حصہ ہے لہٰذا قدرتی بات ہے کہ کشمیر کی درآمد و برآمد کا سارا کاروبار صوبہ پنجاب کے تجارتی مراکز راول پنڈی اور لاہور کے ساتھ ان کے ذریعے ہونے سے کشمیر کی معیشت مضبوط سے مضبوط تر ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ سلسلہ بہت سستا ہے۔ جموں وکشمیر کے دور افتادہ جنگلوں سے نکلنے والی لاکھوں ٹن عمارتی لکڑی بغیر کسی بڑے خرچ کے دریاؤں کے ذریعے پنجاب کے بڑے بڑے جنکشنوں تک پہنچ سکتی ہے۔ وادی کے تمام حصوں سے پھل اور دوسری پیداوار اجناس وغیرہ فی الفور راول پنڈی پہنچ کر 24 گھنٹے کے اندر اندر بک سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی تمام بندرگاہوں کی نسبت کراچی کی بندرگاہ کشمیر کے زیادہ قریب ہے۔ اگر بیرونی ممالک کا تجارتی مال اس بندرگاہ کے ذریعے ریاست میں لایا جائے تو زیادہ سستا پڑتا ہے۔ کشمیر کا صدر مقام سری نگر پٹھان کوٹ سے جو بھارت کا کشمیر کے قریب ترین ریلوے اسٹیشن ہے، 225 میل کے فاصلے پر ہے۔ عام طور پر ایک مال گاڑی کو سری نگر سے پٹھان کوٹ تک پہنچنے میں 48 گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس طرح پھل اور دیگر اجناس منڈی تک پہنچنے سے پہلے تباہ ہو جاتی ہیں جب کہ راول پنڈی سے سری نگر کا فاصلہ صرف 150 میل ہے اور لاری میں صرف 12 گھنٹے کا سفر ہے۔ کشمیری عوام اور ریاست کی آمدن کا دوسرا بڑا ذریعہ سیاحت ہے۔ غیر ملکی سیاح آسانی سے راول پنڈی اور سیال کوٹ کے راستوں سے آسکتے ہیں جب کہ ہندوستانی شہروں کے راستے سے کشمیر تک پہنچنا نسبتاً کافی مشکل ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے بھی کشمیر پوری طرح پاکستان کے ساتھ ملحق ہے جب کہ بھارت سے اس کا کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا۔ ریڈ کلف نے سازش کے تحت گورداس پور ضلع بھارت میں شامل کر کے اس کا بھارت کے ساتھ ایک لمبا اور مشکل سا راستہ بنا تو دیا ہے مگر کشمیر کے تمام قدرتی راستے پاکستان کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر میں آباد لوگ مذہبی' لسانی' نسبی' جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے پاکستان کے باشندوں سے وابستہ ہیں اور ان کی آپس میں رشتہ داریاں ہیں۔ کشمیر سے مختلف اوقات میں ہجرت کرنے والے بے شمار کشمیری کشمیر سے ملحقہ پاکستانی علاقوں میں آباد ہیں اور تہذیبی اور معاشرتی طور پر ایک معاشرہ تصور ہوتے ہیں۔

ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا کہ کشمیر کا الحاق ہر لحاظ سے پاکستان کے ساتھ ناگزیر ہے۔ مگر بھارت اس پر کئی سالوں سے پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ ناجائز قبضہ جمائے بیٹھا ہے جس کی وجہ سے لاکھوں کشمیری بھائی اور بہنیں زندگی یا زندگی کی رونقوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں کے ظلم وزیادتی سے عزتیں تار تار ہو گئی ہیں' خون کی ندیاں بہ گئیں ہیں' ماؤں بہنوں کے سر بے سایہ ہو گئے ہیں۔ معصوم پھولوں کی کلکاریاں یتیم ہو گئی ہیں۔ بوڑھوں کے سہارے ڈھے گئے ہیں۔ مگر کشمیری عوام اپنی آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سات لاکھ بھارتی فوجیوں کے مظالم انہیں آزادی اور ایمان کے راستے سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹا سکے۔ انہیں آزادی کے اس راستے پر ثابت قدم رکھنا پاکستانی قوم کا فریضہ ہے کیوں کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور اس سے غفلت پاکستان کے لیے خسارے اور پستی کا باعث ہوگا۔

آزادی منتظر ہے

آر۔ ایم راہی

شام کے سائے پھیلنے لگے تھے، چرند پرند اپنے اپنے مسکن کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر بوڑھا منیر بٹ چونک اٹھا۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پھیل گئے۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے بابا جان؟" اس کی بہو مریم بی بی کمرے کے دروازے میں آکر بولی۔

"خدا جانے اس وقت کس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے، اسلم بیٹے کو تو سری نگر سے لوٹنے میں ابھی دو دن اور لگیں گے"۔

منیر بٹ چپل پہن کر چھوٹے سے صحن سے ہوتے ہوئے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ "کون ہے؟"

اس کے پوچھنے پر سرگوشی جیسی آواز آئی۔ "میں مجاہد ہوں دروازہ جلدی کھولیں، مجھے پناہ چاہئے!"

منیر بٹ کا دل بے اختیار تیز تیز دھڑکنے لگا۔ مسرت کی لہریں اپنے دل میں اٹھتی ہوئی محسوس کر کے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کنڈی ہٹا کر دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ کالے کپڑے کا ڈھاٹا منہ پر باندھے ایک نوجوان پھرتی سے اندر داخل ہوا۔ منیر بٹ نے دروازے کو دوبارہ کنڈی چڑھائی اور مجاہد کی طرف مڑا۔ "بیٹا! تمہارے اور ساتھی محفوظ ہیں نا؟"

"جی بابا جان! دو ساتھی تھے وہ نکل گئے ہیں لیکن مجھے موقع نہیں ملا اس لئے میں ادھر آ گیا۔"

منیر بٹ کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔ وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ "فکر نہیں کرو بیٹا! یہاں ہم تمہاری حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کریں گے۔"

مجاہد نے اپنے منہ کے گرد لپٹا ہوا کالا کپڑا ہٹایا اور ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ پکڑی ہوئی کلاشن کوف کے گرد لپیٹ دیا۔ منیر بٹ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اسے نور کا ایک ہالہ سا محسوس ہوا۔ کتنا روشن چہرہ ہے، اس نے دل میں سوچا اور کہا "آؤ مجاہد بیٹا! میں تمہیں کمرے میں لے چلوں، تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ میں تمہارے لئے اپنے کمرے میں بستر لگواتا ہوں۔ دوسرے کمرے میں میری بہو اور پوتا بھولا سوئے گا۔ بھولا بڑا پیارا بچہ ہے"۔

وہ مجاہد کو کمرے میں لے آیا اور چارپائی پر بٹھا کر بولا۔ "میں تمہیں مجاہد بیٹا کہوں گا۔ مجھے اپنے مجاہد بیٹوں پر فخر ہے، سارے کشمیر کو اپنے مجاہد بیٹوں پر فخر ہے۔ مجھے یقین ہے میرے شہید بیٹوں کا خون ایک دن ضرور رنگ لائے گا اور کشمیر کی دھرتی پر آزادی کا سورج بہت جلد طلوع ہوگا۔"

کمرے میں زیرو بلب کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجاہد نے سر گھما کر دیواروں کی طرف دیکھا اور پھر چھت پر نظریں گاڑ دیں۔ ہر چیز سے غربت کا احساس ہو رہا تھا۔ منیر بٹ کمرے سے نکلا اور دوسرے کمرے سے چارپائی لے کر آ گیا۔ چارپائی پر چادر ٹھیک کر کے اس نے کہا۔ "میں کھانے کے لئے اپنی بہو کو کہہ دوں"۔

وہ دوبارہ اسی کمرے میں داخل ہوا تو اس کی بہو ایک تھال تختے سے اتار رہی تھی۔ "ابا جان! میں نے جیسے ہی سنا کہ

ہمارا مہمان ایک مجاہد ہے تو میں بہت خوش ہوئی۔ میرا خیال فوراً کھانے کی طرف چلا گیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ میرے مجاہد بھائی نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اس لئے میں نے پہلا کام ہی یہ کیا کہ کھانا دوبارہ گرم کر لیا۔ آپ جائیں، میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

"اللہ تمہیں سکھی رکھے، تم بہت سعادت مند بیٹی ہو۔" منیر بٹ نے کہا اور مجاہد کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"مجاہد بیٹا! تم نے مجھے بابا جان کہہ کر پکارا تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔" وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر بولا۔ "کل تم گھر میں اکیلے ہو گے لیکن پریشان مت ہونا۔ ہم پاس کے گاؤں ڈانگر پورہ جائیں گے۔ وہاں میرے پوتے بھولے کے ننھیال والوں کا گھر ہے۔ اس کے ماموں کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔ کئی دن ہوئے ہم ان کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکے اس لئے آج دوپہر ہی کو میری بہو نے کل کا دن جانے کے لئے طے کیا ہے، ہم شام ہونے سے پہلے گھر لوٹ آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے بابا جان! آپ میری فکر نہ کریں۔ ان کی خوشی میں ضرور شریک ہوں۔ انہی چھوٹی چھوٹی چند خوشیوں کی چمک ہی تو رہ گئی ہے ہماری زندگی میں۔ زندہ رہنے کے لئے یہ خوشیاں حاصل کرنا بہت ضروری ہے!"

بوڑھے منیر بٹ کی آواز ایک دم بھرا گئی۔ "ہاں مجاہد بیٹا! جب تک تم جیسے بیٹوں کا وجود ہے ہم زندگی سے مایوس نہیں ہوں گے۔"

اسی وقت اس کی بہو بڑے سے تھال میں کھانا لے کر آ گئی۔ منیر بٹ نے ایک کونے میں پڑی میز چارپائی کے قریب کھسکائی اور مریم بی بی نے تھال میز پر رکھ کر مجاہد بھائی کو سلام کیا۔ پھر واپس جا کر جگ میں پانی لے آئی۔ جگ میز پر رکھ کر وہ دوسرے کمرے میں اپنے بیٹے بھولے کے پاس بیٹھ گئی۔ بھولا کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ جب صبح بھولا اپنے مجاہد ماموں سے ملے گا تو کتنا خوش ہوگا لیکن ایک بات سوچ کر وہ دل ہی دل میں گھبرا گئی۔ پھر خود کلامی کرنے لگی۔ "نہیں، میں بھولے کو سختی سے کہوں گی کہ وہ کسی سے بھی مجاہد ماموں کا ذکر نہ کرے۔ بھولا بڑا پیارا بچہ ہے، وہ کسی سے بھی یہ ذکر نہیں کرے گا۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ اگر اس نے کسی سے ذکر کیا تو مجاہد ماموں خطرے میں پڑ جائیں گے اور آزادی ہم سے دور چلی جائے گی، اتنی دور کہ .... ان پہاڑوں سے بھی پیچھے!"

اسے یاد آیا کہ بھولا گھر سے نظر آنے والے ان پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا تھا، آزادی ان پہاڑوں میں موجود ہے اور ایک دن پہاڑوں سے اتر کر وادی میں ضرور آئے گی۔

وہ بھولے کے معصوم چہرے پر نظریں جما کر سوچنے لگی لیکن بابا جان کی پکار سن کر چونک اٹھی اور جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ مجاہد بھائی کھانا کھا چکا تھا۔ وہ تھال میں پلیٹیں رکھ کر باورچی خانے میں آئی اور کچھ دیر بعد وہ بھولے کے پاس ہی چارپائی پر لیٹ کر سو گئی۔

اگلی صبح بوڑھے منیر بٹ اور مجاہد نے اکٹھے ہی ناشتا کیا اور مریم بی بی نے باورچی خانے میں .... بھولا سورج نکلنے کے ساتھ ہی جاگتا تھا۔ اس کے جاگنے تک مریم بی بی گھر کے کام کاج میں لگی رہی اور منیر بٹ مجاہد سے ایمان افروز اور ولولہ انگیز واقعات سننے لگا۔ اچانک اسے کوئی کام یاد آیا اور مجاہد کو کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ مریم بی بی گھر کی صفائی ستھرائی کر کے باورچی خانے میں مصروف ہو گئی کہ بھولا آنکھیں ملتا ہوا باورچی خانے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ مریم بی بی بیٹے پر نظر ڈال کر بولی "آؤ بیٹے! منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو، پھر تمہیں مجاہد ماموں سے ملواتی ہوں۔"

بھولا چونکہ نیند میں تھا اس لئے ماں کی بات اس کے دماغ میں صحیح طرح نہ اتری لیکن ماں کے لہجے میں چھپی مسرت کو اس نے محسوس کر لیا۔ اس لئے چاروں طرف کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر نل کے پاس بیٹھ کر منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ جب ماں نے اس کے سامنے ناشتا رکھا تب اس نے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "اماں! ابھی آپ نے کس کا ذکر کیا تھا۔"

ماں بولی۔ "ارے تو ابھی جاگا ہے کیا...... میں نے کہا

تھا۔ تجھے مجاہد ماموں سے ملواتی ہوں۔"

"مجاہد ماموں سے...... یہ کون ہیں اماں؟" بھولے نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

"بیٹا! وہ مجاہد ہے، بھارتی فوجیوں سے ہماری آزادی کے لئے لڑ رہا ہے اور ہمارے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ چند دنوں کے لئے ہمارے گھر میں مہمان ہے۔"

بھولے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مجاہد ماموں سے ملنے کے خیال نے اس کے دل میں عجیب سی مسرت جگادی۔ یہ اس کے لئے بہت ہی اہم بات تھی کہ آزادی کے لئے بھارتی فوجیوں سے لڑنے والا مجاہد ان کے گھر میں مہمان بنا ہے اور وہ بہت قریب سے اس کو دیکھ سکے گا۔ اس کے دل میں فخر کا احساس جاگ اٹھا اور بڑی تیزی سے ناشتا کرنے لگا، پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "اماں! مجاہد ماموں کہاں ہیں؟"

ماں اس کا تجسس اور بے قراری دیکھ کر مسکرائی۔ "بیٹا وہ ساتھ والے کمرے میں ہیں لیکن...... صبر، جانے سے پہلے میری ایک اہم بات سنو۔"

بھولا جاتے ہوئے بادل نخواستہ پلٹا۔ "ہاں اماں، جلدی بولو، کیا بات ہے؟"

"سن بیٹا! کسی سے یہ ذکر بھول کر بھی مت کرنا کہ ہمارے گھر میں کوئی مجاہد چھپا ہوا ہے ورنہ بھارتی فوجی تمہارے مجاہد ماموں کو پکڑ کر قید کر دیں گے، پھر پتا ہے کیا ہو گا...... ہماری آزادی ان پہاڑوں کے پیچھے سے بہت دور چلی جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

"اچھا اماں، نہیں کروں گا کسی سے ذکر، لیکن اب تو مجھے مت روک۔" بھولا جلدی سے بولا اور جلدی جلدی دوسرے کمرے کے دروازے میں داخل ہوا۔ اسے چارپائی پر ایک اجنبی سیدھا لیٹا نظر آیا جو چھت کو گھور رہا تھا۔ اچانک اس نے سر گھما کر بھولے کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ "آؤ، آؤ میرے پاس...... تم بھولے ہو نا!"

بھولے نے جواب میں خاموشی سے صرف سر ہلایا اور جھجکتے ہوئے اس کے قریب آ رکا۔

"بیٹا تم پڑھتے ہو؟"

"جی ماموں جان، میں روز اسکول جاتا ہوں لیکن اب تو کئی دن سے اسکول بند ہے، کرفیو ہے نا۔"

"ہاں بیٹا، یہ بھارتی فوجی برے ہیں...... بہت ہی برے، جنہوں نے بلاجواز یہاں کرفیو لگا رکھا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کون سی جماعت میں پڑھتے ہو؟"

بھولے نے خوشی سے بتایا۔ "مجاہد ماموں! میں چوتھی جماعت میں ہوں، پچھلی دفعہ تیسری جماعت میں میں نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے انعام دیا تھا۔"

"اچھا...... ہمارا بھولا تو بڑا ہونہار ہے۔" مجاہد ماموں نے خوش ہو کر کہا۔ "تمہارے دادا جان بھی تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔"

بھولے کا ننھا سا دل مجاہد ماموں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوشی سے نہال ہو گیا۔ پھر جلدی سے بولا "مجاہد ماموں! اماں کہتی ہیں مجاہد پہاڑوں میں رہتے ہیں، آپ بھی

وہاں رہتے ہیں نا...... آزادی بھی وہیں پر ہے۔ آپ بتائیے نا آزادی کب آئے گی؟"

مجاہد ماموں بھولے کا بے ساختہ سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ "کیا تم آزادی سے ملنا چاہتے ہو؟"

"ہاں مجاہد ماموں، میں کب سے انتظار کر رہا ہوں آزادی کا...... کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گئی؟"

"نہیں بھولے بیٹا۔" مجاہد ماموں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصومیت دیکھ کر بے اختیار اس کا گول مٹول چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ "پہاڑوں پر جاتے ہی میں آزادی کو تمہارا پیغام دے دوں گا...... وہ ضرور آئے گی...... تم اس کا انتظار کرنا لیکن مایوس مت ہونا۔"

"اچھا مجاہد ماموں، میں انتظار کروں گا...... ہم ڈانگر پورہ جا رہے ہیں، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے نا!" بھولے نے کہتے ہوئے مسرت سے مجاہد ماموں کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں بھولے بادشاہ! اگر میرے بارے میں کسی کو پتا چل گیا تو پھر آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔" بھولا ایک دم چونکا۔ "ماں نے بھی یہی کہا تھا!"

قدموں کی آواز سن کر بھولے نے مڑ کر دیکھا۔ دادا جان واپس آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد بھولا اپنی ماں اور دادا جان کے ہم راہ ایک تانگے میں بیٹھ کر ڈانگر پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ماموں کے گھر پہنچ کر وہ ماں کے ساتھ ہی لگا رہا۔ گھر کے دوسرے بچے اِدھر اُدھر مٹی میں کھیل رہے تھے لیکن وہ ان کے پاس نہیں گیا۔ جب اس کی ماں نے نو مولود بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا تو بھولا اس کے کان میں جلدی سے بولا "اماں، منے کی ناک بالکل مجاہد ماموں جیسی ہے!"

ماں نے ایک دم اسے تیز چبھتی ہوئی نظروں سے گھورا، بھولے نے گھبرا کر بے اختیار ہونٹ سختی سے جوڑ کر ان پر شہادت کی انگلی رکھ لی۔ ماں نے کہنی سے اسے ٹھوکا دیا، جیسے کہ رہی ہو، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ بھولا جلدی سے مڑا اور بھاگ کر ماموں کے گھر سے نکل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر پڑوسی کے گھر کا دروازہ تھا، بھولا ادھ کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے صحن کی ایک دیوار کے ساتھ سیب کا درخت تھا جس کے سائے میں قیصر بڑے انہماک سے گیم کھیل رہا تھا۔ قیصر سے اس کی دوستی اس کے کھلونا گیم کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ جب بھی آتا عمر قیصر پاس گیم کھیلنے ضرور آتا۔ بھولا چپکے سے قیصر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے اشتیاق سے اسے کھیلتے دیکھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر قیصر کے ابو چھپر کے نیچے چارپائی پر نیم دراز ہو کر حقہ پی رہے تھے۔ بھولا کچھ دیر خاموشی سے کھڑا رہا پھر بولا "قیصر! میری طرف دیکھو، میں کون ہوں؟"

قیصر نے چونک کر سر اٹھایا، اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی دوڑ گئی۔ "ارے تم...... تم کب آئے؟"

"کچھ دیر پہلے" بھولے نے منہ بنایا۔

"اچھا میرے پاس بیٹھو، گیم کھیلتے ہیں...... دیکھنا آج میں دسواں راؤنڈ بھی پار کروں گا۔"

"دسواں راؤنڈ!" بھولا حیرت سے بولا۔

"ہاں، میں نے ایک دفعہ اس کو پار بھی کیا ہے۔" قیصر نے بڑے فخر سے کہا اور بھولا اشتیاق سے چپ چاپ قیصر کو گیم کھیلتے دیکھتا رہا۔ کافی دیر بعد جب قیصر نے دسواں راؤنڈ بھی پار کر لیا اور جب گیارہویں راؤنڈ میں اس کے تمام کھلاڑی مر گئے...... تب اس کا انہماک ٹوٹا۔ بھولا خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے قیصر کو دیکھنے لگا۔ یکا یک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے ذہن سے مرعوبیت کا احساس غائب ہو گیا۔ وہ بڑے فخر سے بولا۔ "قیصر! ہمارے گھر میں ایک مہمان ہیں، میں انہیں مجاہد ماموں کہتا ہوں"۔

"مجاہد ماموں؟" قیصر اچھل پڑا۔

بھولے نے قیصر کے چہرے پر حیرت اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر احساس فخر سے سر اونچا کیا اور ایک عجیب سا سکون محسوس کرنے لگا۔ "ہاں، وہ پہاڑوں سے اتر کر آئے ہیں۔ وہ ہماری آزادی کے لئے بھارتی فوجیوں سے لڑتے ہیں...... اب وہ ہمارے گھر میں ہیں...... وہ اتنے اچھے ہیں کہ میں بتا

نہیں سکتا!"

"اے بیٹا! ابھی کیا کہا تم نے' ذرا پھر سے بول!"

بھولا گھبرا کر قیصر کے ابو کی طرف مڑا۔ "میں نے...... میں نے کہا......!" بھولے نے اچانک سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اسے ایک دم ماں کی بات یاد آ گئی اور پھر خوف سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "میں نے کچھ نہیں کہا۔" وہ چلا کر باہر کی طرف دوڑا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو قیصر کے ابو چارپائی سے اتر کر چپل پہن رہے تھے۔

"اف یا اللہ' یہ میں نے کیا کیا۔ اب ...... اب مجاہد ماموں خطرے میں پڑ جائیں گے اور پھر آزادی پہاڑوں سے بہت دور پیچھے چلی جائے گی۔" وہ پریشانی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ اسے خود پر سخت غصہ آرہا تھا کہ اس نے قیصر کے سامنے مجاہد ماموں کا ذکر ہی کیوں کیا۔ وہ خود کو قصوروار سمجھ کر رو پڑا۔ روتے روتے یکایک اس کے ذہن میں ایک بات آئی اور اس نے ایک فیصلہ کر کے مٹھیاں سختی سے بند کر کے دوڑ لگا دی۔ اس کا رخ نور پور میں اپنے گھر کی طرف تھا جو تین میل دور تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا' دوڑتے دوڑتے کئی بار ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے گھٹنوں اور کہنیوں پر کئی زخم آئے لیکن وہ مسلسل دوڑتا رہا۔ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے تھکاوٹ سے اس کا حال برا ہو گیا تھا۔ اس کی کمزور ٹانگیں دکھنے لگی تھیں لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ اس کی وجہ سے آزادی اس سے دور چلی جائے گی اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گی!

یکایک اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ بری طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ چند لمحے اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جیسے ہی دماغ کے کسی کونے میں خطرے کا الارم بجا' وہ تڑپ کر اٹھا...... ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ تھکن اور زخموں نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ رونے لگا تھا۔ اس کی رفتار بھی آہستہ ہو گئی تھی۔ اسے ہر لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ گر پڑے گا اور پھر کبھی اٹھ نہیں سکے گا لیکن دل میں موجزن جذبے نے اس کے ناتواں وجود کو سنبھالا دے رکھا تھا۔

پھر جیسے ہی اسے گھر کا دروازہ کچھ فاصلے سے نظر آیا اس کے قدموں میں تیزی آئی لیکن اس کی نقاہت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ خود کو سنبھال بھی نہیں سکا اور ایک دھماکے سے دروازے کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا۔

وہ ہوش میں آیا تو مجاہد ماموں کو اپنے سرہانے بیٹھے پایا۔ "کیا ہوا تھا بھولے! تم امی اور دادا جان کو چھوڑ کر کیوں آئے؟"

بھولا مجاہد ماموں کے لہجے میں تشویش دیکھ کر بری طرح چونکا۔ "آ...... آزادی خطرے میں ہے!"

"کیا کہ رہے ہو بھولے؟" مجاہد ماموں بھی چونک اٹھے۔

بھولے نے مشکل سے آواز کو قابو کر کے کہا۔ "مجاہد ماموں! میں نے اپنے دوست قیصر کو آپ کے بارے میں بتادیا تو اس کے ابو نے میری باتیں سن لیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے تو میں بھاگ اٹھا اور پھر وہ بھی چپل پہن کر میرے پیچھے نکلے۔ میں گھبرا کر سیدھا آپ کے پاس آ گیا۔"

"اف بھولے! یہ تم نے کیا کر دیا!" مجاہد ماموں کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"کک...... کیا آزادی......؟" بھولے نے گھبرا کر کہنا چاہا لیکن مجاہد ماموں جلدی سے بولے۔ "نہیں' نہیں تم پریشان مت ہو' تم نے اچھا کیا کہ آ گئے' تم بہت بہادر ہو کیوں کہ تم نے بہادری والا کام کیا ہے۔"

"کیا سچ مجاہد ماموں جان؟" بھولا ایک دم زخموں میں اٹھنے والی ٹیسیں بھول گیا۔

"ہاں' اب تم آرام کرو' ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو' لیکن اب میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں مجاہد ماموں؟"

مجاہد ماموں نے پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ان پہاڑوں پر' آزادی کو تمہارا پیغام بھی تو پہنچانا ہے نا۔ اچھا' اب تم اکیلے ڈرنا مت کیوں کہ تم بہت بہادر ہو۔ ٹھیک ہے!"

"ٹھیک ہے ماموں جان!" بھولے نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ مجاہد ماموں چلے گئے تو وہ سوچ رہا تھا کہ امی اور دادا جان مجھے غائب پا کر بہت پریشان ہوں گے لیکن یہاں آ کر جب انہیں بتاؤں گا کہ آزادی خطرے میں تھی، اور اب نہیں ہے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ بھولا دوران پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں آزادی اس کے پیغام کی منتظر تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ ناچنے لگی تھی۔ اسے زخموں کی ٹھیسیں بھی اب زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔

لیٹے لیٹے بھولا پیاس محسوس کر کے مٹکے کے پاس آیا۔ گلاس منہ سے لگا کر ایک گھونٹ حلق سے اتارا ہی تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھلا اور فوجی دندناتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گئے۔ بھولے کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گر پڑا۔ دو فوجیوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اچانک بھولے کی نظر قیصر کے ابو پر پڑی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی منحوسیت چھائی تھی۔ بھولے کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

فوجی گھر کی تلاشی لے کر ناکام لوٹے تو بھولا اپنے ننھے سے دل سے ڈر نکال کر پھینک چکا تھا۔ اس نے فوجیوں کو مخاطب کیا۔ "مجاہد ماموں تو چلے گئے، میں نے ان کو ایک پیغام بھی دیا ہے 'آزادی کے لئے...... آزادی ان پہاڑوں میں ہے نا' مجھے پتا ہے تم ان پہاڑوں سے بہت گھبراتے ہو!"

فوجی نے جوش میں آ کر اسے تھپڑ مارا۔ "بتاؤ کہاں گیا وہ اور تم نے اسے کیا پیغام دیا۔ بولو' ورنہ گولی مار دوں گا تمہیں۔"

بھولے کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ "مجاہد ماموں آئیں گے تو میں تم سے بدلہ ضرور لوں گا۔"

فوجی کے دل پر تازیانہ پڑا' اس نے بھاری بھرکم بوٹ سے بھولے کے سینے پر لات دے ماری اور بھولا ایک چیخ کے ساتھ اچھل کر دور جا گرا۔ بھولا تڑپ کر اٹھا اور ہاتھ میں آیا ہوا ایک پتھر فوجی کی طرف پھینک دیا۔ فوجی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر لپکا' بھولا ایک اور لات کھا کر گر پڑا' اسے آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔ اس نے کراہ کر اٹھنا چاہا لیکن فوجی نے وحشت زدہ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے گن کا ٹریگر دبا دیا...... چند جھٹکے کھا کر بھولا ساکت ہو چکا تھا۔ گھر کے آنگن سے اس کی آنکھیں ان پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں آزادی کو اس کے پیغام کا انتظار تھا۔

کمہار کا پوتا

حامد مشہود

شہزادہ فلک بوس پرلے درجے کا مغرور، بد دماغ اور تنک چڑھا نوجوان تھا۔ وہ خود کو انسان اور دوسروں کو حیوان سمجھتا تھا۔ شہزادہ اگر کبھی شہر میں نکلتا تو سپاہی اس کی سواری کے آگے آگے "ہٹو بچو، ہٹو بچو" کی آوازیں لگا کر دور دور تک راستہ صاف کر دیتے تھے۔ کسی میں جرات نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر شہزادے کے روبرو اپنا کوئی مسئلہ بیان کر سکے۔

اس ملک کے نظام حکومت میں دور اندیش نامی خاص مشیر اور وزیر باتدبیر کا بہت عمل دخل تھا۔ دور اندیش کم گو، دانش ور اور صابر شخص تھا۔ بادشاہ فلک شیر شاہ بھی اکثر اس کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا تھا۔ دور اندیش ولی عہد فلک بوس کی مغرورانہ عادتوں کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ فلک بوس گھمنڈ اور تکبر کو چھوڑ دے کیوں کہ کل کلاں کو اسی نے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔

ایک روز قریبی ملک کا بادشاہ فلک شیر شاہ سے ملنے آیا۔ اس نے دو دن وہاں قیام کیا۔ جاتے وقت وہ تمام شاہی خاندان کو اعلیٰ درجے کے سوت سے بنے ہوئے کپڑے کے خاص ملبوسات دے کر گیا۔ شہزادے نے وہ عام سا لباس دیکھا تو اٹھا کر پرے پٹخ دیا۔ وزیر دور اندیش نے اس کی بد تمیزی پر افسوس کا اظہار کیا اور شہزادے سے کہا "محترم ولی عہد! کسی کے تحفے کو ٹھکرانا بہت ناشائستہ بات ہے۔ یہ سوتی لباس ہمسایہ ملک کا روایتی لباس ہے۔ تحفہ مہنگا ہو یا سستا قابل قدر ہوتا ہے"۔

"مگر ہم ایسے سستے لباس کا تحفہ ٹھکراتے ہیں۔ یہ ہماری توہین کی گئی ہے" ولی عہد نے بگڑ کر کہا۔

وزیر باتدبیر نے اس احمق ولی عہد کو سمجھانے کی غرض سے کہا "شہزادہ عالم! تحفے کے پیچھے چھپا ہوا خلوص تلاش کرنا چاہیے۔ آپ دانا اور پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کے علم میں وہ حکایت تو ضرور ہو گی کہ کسی صحرا کا ایک بدو میٹھے پانی کا ایک گھڑا بھر کر کسی بادشاہ کی طرف چل دیا۔ صحرا میں میٹھا یعنی پینے والا پانی ایک نعمت خاص سے کم نہیں ہوتا۔ وہاں ایسا پانی یا تو کسی نخلستان میں ملتا ہے یا کسی دور دراز کے کنویں میں۔ لہٰذا وہ بدو اس پانی کا تحفہ لے کر بادشاہ وقت کی خدمت میں حاضر ہونے چلا۔ اس سادہ لوح صحرائی کسان کے علم میں یہ نہیں تھا کہ بادشاہ کا محل شہر میں واقع ہے اور اس کے محل میں میٹھے اور کھارے پانی کی کوئی کمی نہیں۔

وہ بدو محل تک پہنچا تو اسے دربان نے بتایا کہ بادشاہ سلامت کشتی میں سیر کرنے کے لیے دریا پر گئے ہیں۔ بدو نے دریا کی سمت دریافت کی اور دریا پر جا پہنچا۔ بادشاہ دریا کی سیر کر چکا تھا، اس کی کشتی کنارے لگ چکی تھی۔ کنارے پر بہت سے درباری اور سپاہی کھڑے تھے۔ بدو کشتی کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ اس نے کنارے کے قریب جا کر زندگی میں پہلی بار دریا دیکھا۔ دریا کیا تھا، پانی کی موجیں اٹھ رہی تھیں اور بڑی بڑی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ اس دریا میں کروڑوں گھڑوں سے زیادہ پانی موجود تھا۔ بدو یہ دیکھ کر بہت افسردہ ہوا۔ اس دریا کی موجودگی میں بھلا اس ایک گھڑے کی کیا وقعت تھی۔ چناں چہ اس نے اپنے گھڑے کا پانی نیچے بہا دیا اور مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

بادشاہ نے کشتی میں سے اترتے وقت یہ عجب ماجرا دیکھا۔ وہ حیران ہوا کہ دریا پر تو لوگ پانی کے گھڑے بھرنے آتے ہیں مگر یہ کیسا شخص ہے کہ پانی سے لبریز گھڑا دریا کے کنارے پر بہا کر لوٹ گیا ہے۔ اس کے حکم پر سپاہی بدو کو بلا لائے۔ بادشاہ نے اس سے اصل ماجرا دریافت کیا تو بدو نے سب کچھ کہہ دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ اس پر خلوص بدو کے گھڑے کو سونے میں تول دیا جائے کیوں کہ تحفے سے زیادہ اہم خلوص ہوتا ہے جو تحفہ دینے والے کے دل میں ہوتا ہے"۔

شہزادہ یہ حکایت سن کر پہلے تو خاموش ہو گیا پھر اس نے بہانہ تراشا "میرا نام فلک بوس ہے، آسمان کو چومنے والا یعنی

بہت ہی اعلیٰ اور بلند وبالا' میں ولی عہد بھی ہوں لہٰذا ایک اعلیٰ ولی عہد ہونے کے ناتے میرا جو جی چاہے گا کروں گا۔ اپنی مرضی سے کھاؤں اور پہنوں گا"۔

دوراندیش نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ولی عہد اس لباس کو ایک ٹھوکر جما کر وہاں سے چل دیا۔

خدا کا حکم کہ بادشاہ چند روز بعد مختصر عرصہ بیمار رہ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ شہزادے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔ آخر شہزادے کی رسم تاج پوشی کی گئی اور وہ فلک بوس شاہ بن گیا۔ فلک بوس شاہ ملکی معاملات سے آگاہ نہیں تھا اس لیے وہ دوراندیش سے مسلسل رابطہ رکھتا تھا۔ چند ماہ بعد ملک کی ایک سرحد پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ فلک بوس نے چند درباریوں کو دوراندیش کے ہم راہ روانہ کیا تاکہ ہمسایہ ملک کے بادشاہ ارجمند شاہ کے ساتھ بات چیت کی جائے۔ اس جماعت کے ساتھ ایک سو سپاہی بھی تھے۔

چند روز بعد وہاں سے اطلاع آئی کہ دوراندیش نے ہمسایہ ملک کے ارجمند شاہ کے ساتھ معاملات طے کر کے سرحد پر امن وامان قائم کر دیا ہے اور وہ وفد واپس آنے کے لیے تیار ہے۔ فلک بوس شاہ اپنے خاص مشیر اور وزیر باتدبیر یعنی دوراندیش کی دانش مندی سے بہت خوش ہوا کہ اس نے جنگ و جدل کے بغیر سرحد کو پر امن بنا دیا تھا۔

اس اطلاع کے آنے کے بعد ساتویں روز شاہی وفد محل میں آ پہنچا۔ سب درباریوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ سپاہیوں نے اپنی ٹوپیاں اتار رکھیں تھیں۔ یہ معمہ تب حل ہوا جب ایک رتھ میں سے دوراندیش کی میت نکالی گئی۔ مراد نامی ایک درباری نے آگے بڑھ کر فلک بوس شاہ کو سلام کیا اور عرض کیا "عالم پناہ! وزیر صاحب ہمسایہ ملک سے روانہ ہونے کے دن ہی بیمار ہو گئے تھے۔ آخر انہوں نے آج صبح اس شہر سے 50 میل دور دم دے دیا۔ انہوں نے ایک رقعہ آپ کے نام لکھ دیا تھا اور ایک گلا آپ کے لیے پیش کیا ہے۔ شاید انہیں اپنی موت کا پکا یقین ہو چکا تھا"

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر رقعہ اور مٹی کا گلا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے رقعہ کھولا' لکھا تھا۔

"ظلِ سبحانی! امید ہے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیش تر میری زندگی کا چراغ بجھ جائے گا۔ لہٰذا میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ میری نیک خواہشات اور دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کے والد شاہ معظم فلک شیر مرحوم بہت کفایت شعار شخص تھے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی بچت کو اپنی عادت بنا لیں اور اس گلے میں کم از کم ایک بار دولت ضرور جمع کر لیں پھر اسے اپنے مبارک ہاتھوں سے توڑیں تاکہ آپ میں بھی کفایت شعاری پیدا ہو۔ آپ کی دعاؤں کا طالب' قریب المرگ...... دوراندیش"۔

فلک بوس شاہ نے مٹی سے بنے ہوئے گلے کو گھور کر دیکھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اسے نیچے پھینک کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا اور کہتا کہ وزیر نے مجھے کوئی کنگلا جان رکھا ہے کہ میں بھی ایک برتن میں روپے جمع کروں" مگر اس غم گین موقع پر اس نے صبر و تحمل اور ضبط سے کام لیا اور دونوں چیزوں کو تخت

کے ایک طرف پڑے تھال میں رکھ دیا جس میں اس کے لیے خشک میوے پڑے رہتے تھے۔ فلک بوس شاہ واقعی وزیر باتدبیر کی ناگہانی موت سے پریشان تھا۔ اس نے فوراً دربار سمیٹ دیا اور اپنے اس خاص مشیر کے کفن دفن کا حکم دیا۔

دوسرے دن شام کے وقت موسم بہت سہانا تھا' شاہ کے حکم پر ایک کنیز تخت کے پاس پڑا میووں سے بھرا ہوا تھال اٹھا کر باغ میں چھوڑ آئی۔ بادشاہ بھی وقت گزارنے اور ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے باغ میں پہنچ گیا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے خشک میوہ جات کھانے کے لیے جب تھال کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ دونوں چیزیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے مرحوم وزیر کا رقعہ تار تار کر ڈالا' گلے کو اٹھا کر پھولوں کی کیاری میں پھینک دیا اور مزے کے ساتھ پستہ اور انجیر کی لذت اٹھانے لگا۔

اسی رات شاہ کو خبر ملی کہ سرحدی شہر مثل میں وہاں کے راجا کی حمایت سے سخت بغاوت سر اٹھا رہی ہے۔ فلک بوس شاہ نے فیصلہ کیا کہ مثل پر فوراً لشکر کشی کی جائے اور باغیوں کو کچل دیا جائے کیوں کہ شہر مثل بہت قیمتی شہر تھا۔ بادشاہ اس قیمتی شہر کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کے حکم پر طبل جنگ پر چوٹ پڑی اور ساری سپاہ زور و شور کے ساتھ تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ لوہاروں نے بھٹیاں گرم کر لیں' آہن گروں کے ہتھوڑے چلنے لگے۔ جنگ جو اصطبل میں آ کر اپنے گھوڑے کے نعل دیکھ کر اطمینان کرنے لگے۔

مگر بدقسمتی سے ہوا یہ کہ صبح سویرے بادشاہ اپنے بستر میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ اس نے لشکر کو روانہ ہونے سے روکا اور شاہی طبیب ابو طب کو طلب کیا۔ ابو طب نے بادشاہ کی آنکھوں پر کوئی خاص مرہم لگایا تو اسے آفاقہ محسوس ہوا۔ بادشاہ آنکھیں موند کر بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اگلی پچھلی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اچانک اسے مرحوم وزیر کی بیان کردہ نظم یاد آئی جو اس نے فلک شیر شاہ کو اس کی موجودگی میں سنائی تھی۔ نام تھا ''عقاب کا غرور'' یہ قدیم فارسی ادب کی ایک نظم ہے جو حکیم ناصر خسرو نے لکھی ہے۔ اس میں بیان ہے کہ ایک بلند پرواز عقاب اپنے آپ پر اتراتا جا رہا تھا کہ دنیا کا کوئی پرندہ میرا اہم پلہ نہیں۔ سب کی سب دنیا میرے پروں کے نیچے ہے۔ میں کوڑے کرکٹ پر پھڑ پھڑاتے مچھر کو بھی بلندی سے دیکھ سکتا ہوں۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر مست ہو گیا کہ اسے طاقت کے نشے میں گرد و پیش کی خبر تک نہ رہی' اچانک ایک پہاڑ کے کونے میں سے کسی ماہر تیر انداز نے اس پر ایک تیر چست کر دیا۔ یوں اس کا غرور ہی اس کی تباہی کا سبب بن گیا۔ فلک بوس شاہ نے اس نظم پر خوب غور کیا تو اسے سمجھ آیا کہ طاقت کا نشہ اسے بھی لے ڈوبے گا۔ لہٰذا مثل کے راجا کے ساتھ جنگ سے زیادہ بات چیت کو ترجیح دینا ہو گی۔

ابو طب نے بادشاہ کا دو دن علاج کیا تو بادشاہ نے شفا پائی۔ بادشاہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ خود روانہ ہوا۔ ابو طب نے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو بادشاہ نے اسے روک دیا کیوں کہ ابو طب عمر کے آخری حصے میں تھا اور کمزوری کی وجہ سے طویل سفر کے قابل نہ تھا۔ پھر بھی اس حاذق حکیم نے بادشاہ کے رتھ میں آشوب چشم کی دوا رکھ دی تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ تیسرے دن کے سفر کے بعد لشکر نے میدان تنگ روز میں ڈیرے ڈال دیئے۔ اپنے رتھ میں سے باہر نکلتے وقت فلک بوس شاہ کی نظر اچانک پیتل کی ڈبیا پر پڑی۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سفید مرہم تھا جو ابو طب نے ساتھ رکھ دیا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی گردن تن گئی۔ اس نے سوچا میں اتنا بڑا بادشاہ ہوں اور میری دوا اس پیتل کی ڈبیا میں؟ اس نے ڈبیا گھما کر یوں رتھ سے باہر پھینکی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر وہ بڑبڑایا:

''کیا میرے خزانے میں کوئی سونے اور چاندی کی ڈبیا نہیں ہے' اونہہ میں کوئی گھسیارہ تھوڑی ہوں''

دوسرے روز جب سورج ڈھل گیا تو بادشاہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ اٹھا۔ وہ پھر سے بیمار پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے درد نے اسے بے حال کر ڈالا تھا۔ اس نے سوچا ''کاش! میں اس مرہم کو ضائع نہ کرتا کاش میں اس وقت تکبر سے کام نہ لیتا کاش...... اے کاش''

گزرا ہوا وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا' اس لیے کوئی

بھی کام یا بات کرنے سے پہلے انسان کو خوب غور و فکر کرنا چاہیے ورنہ پھر انسان کاش کاش کرتا رہ جاتا ہے۔ لیکن پھر سر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لشکر کے ساتھ زخمیوں کا علاج کرنے کے لیے معالج اور جراح تو موجود تھے مگر ان کی دواؤں سے بادشاہ کو ذرہ بھر آفاقہ نہ ہوا اور وہ ساری رات اپنے خیمے میں بستر پر لوٹتا رہا۔ مثل وہاں سے صرف ستر میل دور رہ گیا تھا مگر بادشاہ کی حالت بگڑ گئی تھی۔ بادشاہ اب نہ مثل کی طرف جا سکتا تھا اور نہ واپس اپنے شہر نفان کی طرف لوٹ سکتا تھا۔ اس کا لشکر آندھی کی طرح منزلوں پہ منزلیں مارتا ہوا، ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کر کے وہاں پہنچا تھا مگر فلک بوس شاہ کی بیماری ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ شاہ کے وفادار سپاہی ایک قریبی شہر سے ایک ماہر معالج کو صبح سویرے بلا لائے۔ اس بوڑھے معالج نے ساری بات توجہ کے ساتھ سنی اور کہا "بادشاہ سلامت! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں"۔

شاہ نے کراہ کر کہا "امان ہے امان ہے، جلدی عرض کرو"۔

بوڑھے معالج نے مودب ہو کر کہا۔ "توا لوہے سے بنا ہوتا ہے اور مٹی کھودنے والی کدال بھی لوہے سے بنتی ہے۔ مگر روٹی توے پر ہی کیوں پکائی جاتی ہے؟ اس مقصد کے لیے کدال کو کیوں نہیں استعمال کیا جاتا؟"

شاہ نے زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر کہا "ہر چیز کا اپنا مقصد ہے۔ دنیا کی ایک چیز دوسری چیز کا کام نہیں کر سکتی"۔

بوڑھے معالج نے سر جھکا کر اسے سلام کیا اور عرض کیا "خدا آپ کا اقبال بلند کرے، آپ کی بات سے ثابت ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز فالتو نہیں ہے چناں چہ آپ اس پیتل کی ڈبیا کو ڈھونڈ لائیں جس میں مرہم تھا۔ اس پیتل کا دوا پر ضرور کوئی اچھا اثر ہوتا ہوگا"۔

فلک بوس شاہ نے چند سپاہیوں کو میدان تنگ روز میں سے وہ پیتل کی ڈبیا ڈھونڈ کر لانے کا حکم دیا۔ اس نے سپاہیوں کو بتایا کہ جب اس نے وہ ڈبیا گھما کر پھینکی تھی تو وہ ایک شاہ بلوط کے بوڑھے درخت کے پاس جا گری تھی۔ شاہ کے سپاہی تیز ترین عربی گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے۔ شاہ سارا دن آنکھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ اس کا تکبر خاک میں مل گیا تھا اور وہ سونا چاندی ہونے کے باوجود پیتل سے شکست کھا گیا تھا۔ شام ڈھل گئی تو موسم ابر آلود ہو گیا۔ شاہ نے دعا کی:

"یا خدا!...... یہ کالی گھٹا یہاں پر نہ منڈلائے بلکہ کہیں دور چلی جائے"۔

فلک بوس شاہ ماضی میں کہتا تھا "آندھی ہو یا طوفان ہمارے محل کم زور نہیں۔ بارش ہو یا سیلاب ہمارے محلوں کے ستون بہت بلند ہیں"۔

وقت نے اس مغرور اور امیر کبیر بادشاہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیا تھا۔ رات گہری ہوئی تو اس نے اپنے سابقہ تکبر اور غرور سے توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی "یا اللہ! یہ کالے بادل بار بار چودھویں

کے چاند کے اوپر سایہ فگن نہ ہوں ورنہ رات اندھیری ہو گئی تو میرے سپاہی راستہ کھو دیں گے اور بھٹک جائیں گے"۔

بے شک اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے حکم سے بادلوں نے چاند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا بند کر دی اور شاہ کے سپاہی آدھی رات کے وقت پیتل کی ڈبیا لے کر آ پہنچے۔ بادشاہ نے مرہم اپنی آنکھوں پر لگایا تو اسے کچھ دیر بعد آفاقہ محسوس ہوا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت اس نے لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ لشکر نے آخر کار دریائے آبادان کے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

دریا کی دوسری طرف مثل کا قیمتی شہر تھا جو پہاڑوں میں گھری ہوئی خوب صورت وادی تھی۔ بادشاہ نے شہر کے راجا "پہلوان سروبالا" کو اپنے آنے کی خبر دی اور بات چیت کی پیش کش کی۔ راجا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا' راجا کا نام اس کے والدین نے بالکل ٹھیک رکھا تھا۔ وہ چھت جتنا اونچا شخص تھا اور ہاتھی کی طرح موٹا تھا۔ اس شہر میں اٹھنے والی بغاوت کی وجہ چند شکایات تھیں جو عوام کو شاہی کارندوں اور سپاہیوں سے تھیں۔ فلک بوس شاہ نے اس شہر کے تمام نااہل سرکاری ملازمین بدل دیئے اور خون خرابہ کئے بغیر پہلوان سروبالا کے ساتھ صلح کر لی اور واپسی کی راہ لی۔ اگر وہ صلح میں ناکام رہتا تو پھر ظاہری نتیجہ جنگ ہی تھا کیوں کہ پہلوان سروبالا کے پاس نہ صرف اپنے جنگ جو تھے بلکہ شہر کے لوگ بھی اس کے اشارے پر کٹنے مرنے کے لیے تیار تھے۔

فلک بوس شاہ اپنے شہر پہنچا تو اس نے محل میں داخل ہوتے ہی فوراً باغ کا رخ کیا۔ اس کی عقل ٹھکانے آچکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وزیر مرحوم کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔ ابو طب کی دی ہوئی پیتل کی ڈبیا میں کوئی مصلحت ہے تو اس گلے میں بھی کوئی راز چھپا ہو گا۔ اس نے پھولوں کی کیاری میں سے گلا ڈھونڈ لیا اور پھر روزانہ اس میں اشرفیاں ڈالنے لگا۔ چند ہفتوں میں وہ گلا بھر گیا تو اس نے اسے توڑ کر تمام اشرفیاں باہر نکال لیں۔ اس گلے کی اندرونی طرف ایک ننھی ریشمی تھیلی بندھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے وہ تھیلی برتن سے جدا کی اور اسے کھولا۔ اس میں سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔ شاہ وہ لکھائی سینکڑوں تحریروں میں سے پہچان سکتا تھا۔ وزیر مرحوم نے لکھا تھا۔

"عالی جاہ! میری زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ آپ کے والد محترم' بندہ پرور فلک شیر شاہ نے مجھ ناچیز کے مشورے پر محل کی جنوبی سرنگ میں پہلے پتھر کے نیچے گڑھا کھود کر دو چیزیں چھپائی تھیں۔ ایک خزانہ اور دوسرا خفیہ سرنگوں کا نقشہ۔ یہ دونوں چیزیں بہت اہم ہیں۔ اس خزانے میں ایسے ایسے بیش قیمت موتی ہیں جو شاہی خزانے میں بھی موجود نہیں۔ نیز خفیہ سرنگیں کسی برے وقت میں دشمن سے جان بچانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور اس نقشے کے بغیر وہ سرنگیں بے کار ہیں۔ یہ خط میں اس ریشمی تھیلی میں چھپا کر اس سادہ برتن میں چھپا کر بھیج رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان دونوں چیزوں کا بہتر استعمال ہی کریں گے اور اپنے آباؤ اجداد کے نام کو روشن کریں گے۔ میں یہ خط کھلا بھیجتا تو میرے مرنے کے بعد ساتھی درباری خزانہ نکال لیتے اور وہ نقشہ کسی دشمن کے ہاتھوں فروخت کر سکتے تھے۔ ان دونوں چیزوں کی اہمیت آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ فقط 'کمہار کا پوتا...... دور اندیش بقلم خود"

فلک بوس شاہ جانتا تھا کہ دور اندیش ایک کمہار کا پوتا تھا۔ ایک عقل مند کمہار کا فن اس کے کتنا کام آیا تھا' یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے آگے سجدے میں گر گیا۔ وہ بلک بلک کر اس قدر رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس نے فریاد کی "یارب العالمین! میں آئندہ کسی انسان یا کسی چیز کو حقیر نہیں جانوں گا۔ بے شک اس دنیا کا ہر انسان قابل احترام ہے اور ہر چیز کارآمد ہے۔ میں گھمنڈ اور غرور سے توبہ کرتا ہوں۔ میں آسمان نہیں ہوں بلکہ زمین پر رہنے والا انسان ہوں جو مٹی سے بنا ہے اور اس نے ایک روز مٹی میں مل جانا ہے۔ تو مجھے معاف کر دے تاکہ اگلے جہان میں میرا حشر اچھے اور نیک انسانوں کے ساتھ ہو۔ یارب العالمین! تو اس قدر بڑا ہے کہ تو نے عام انسانوں کو وسیع عقل عطا کر رکھی ہے تو مجھے بھی عقل، علم اور شعور بخش دے...... آمین ثم آمین' یارب العالمین۔

محمد معروف چشتی

چاچو چاند ہوئے اغوا

"اس مرتبہ جو لڑکا ہم نے اغوا کرنا ہے وہ شیخ احسان احمد کا بیٹا ہے۔ لڑکا کالج میں پڑھتا ہے۔ کلین شیو ہے، نظر کا چشمہ لگاتا ہے، اپنی گاڑی میں آتا جاتا ہے اور سب سے اہم نشانی یہ ہے کہ کل وہ ایک انتہائی نفیس اور قیمتی موتیوں والی ٹوپی پہن کر کالج جائے گا۔ کیوں کہ کل کالج میں ایک پروگرام ہے اور یہ ٹوپی وہ اکثر خاص پروگراموں پر ہی پہنتا ہے۔ تم یہ سب علامات ذہن نشین کر لو اور اس کے اغوا کا منصوبہ تیار کر لو"۔

اغوا برائے تاوان کا دھندا کرنے والے گروہ کے باس ٹونی نے اپنے ساتھیوں کو تفصیلات بتائیں۔ ان کا کام ہی یہی تھا وہ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے امیر گھرانوں کے بچوں کو اغوا کرتے اور تاوان کے طور پر بھاری رقوم وصول کرتے۔ اس مرتبہ ان کا نشانہ شیخ احسان احمد کا بیٹا افغان احمد تھا جو چاچو چاند کا ہم جماعت اور گہرا دوست تھا۔ چاچو چاند اتنے امیر تو نہ تھے مگر افغان خود بہت سلجھا ہوا اور ذہین لڑکا تھا، اس لیے وہ صرف امیر لڑکوں سے نہیں بلکہ ہر اچھے لڑکے سے دوستی رکھتا تھا۔ چاچو چاند کو وہ ان کی سادگی اور بھولی بھالی طبیعت کی وجہ سے بہت پسند کرتا تھا اور پڑھائی میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔

فنکشن کے دن سب لڑکے بہت خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے بھی بچوں کی طرح شرارتیں کر رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ افغان اور چاچو چاند ایک الگ کمرے میں بیٹھے کاغذ ہاتھ میں پکڑے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دراصل آج انہیں فنکشن میں ایک خاکہ پیش کرنا تھا۔ خاکے میں چاچو نے ایک مسخرے کا کردار ادا کرنا تھا اور افغان نے ان کے دوست کا کردار کرنا تھا۔ جب چاچو اسٹیج پر آئے تو مکالمے بولنے سے پہلے ہی سارے لڑکے ان کا حلیہ دیکھ کر ہنس پڑے۔ پھر جب چاچو نے خاکہ پیش کیا تو سب کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔

پروگرام ختم ہوا تو سب بہت خوش تھے کیوں کہ پروگرام بغیر کسی گڑبڑ کے اختتام کو پہنچا تھا۔ اب چاچو اور افغان نے مسخروں کا حلیہ ختم کر کے اپنے اپنے کپڑے پہن لیے تھے کیوں کہ وہ گھر واپس جانے لگے تھے۔ افغان کہنے لگا۔ "چاند! آج تم میرے ساتھ ہی چلو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا"۔

"ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔ آج میں بھی بائی سکل نہیں لایا"۔

پھر چاچو افغان کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی چاچو نے کہا "افغان تمہاری ٹوپی بہت خوب صورت ہے۔ ذرا دکھاؤ تو کہاں سے لی ہے؟"

افغان نے ٹوپی اتار کر چاچو کو دے دی۔ چاچو نے ٹوپی دیکھی اور سر پر پہن لی۔ اب ان کی گاڑی کالج سے باہر نکل چکی تھی۔ چند منٹ سفر کرنے کے بعد ان کے پیچھے آنے والی گاڑی یک دم ان سے آگے نکلی اور راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ افغان نے زبردست بریک لگا کر گاڑی روکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، چار آدمی گاڑی میں سے نکلے۔ دو نے افغان کے سر پر پستول مار کر اس کو بے ہوش کر دیا اور دو نے چاچو چاند کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں لا پھینکا اور فرار ہو گئے۔

"ارے ارے کیا کر رہے ہو بھئی، اور کون ہو تم؟" چاچو نے گھبرا کر کہا۔ وہ لوگ اس کے ہاتھ اور آنکھیں جو باندھ رہے تھے تاکہ چاچو کوئی چالاکی نہ کر سکیں۔

"زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے بیٹھو" ایک بدمعاش نے کہا۔

"پہلے میں کوئی شرارتیں کر رہا تھا جو آرام سے بٹھانے کے لیے اغوا کر لیا ہے"۔

"اب بولے تو تھپڑ لگا دوں گا" دوسرا بدمعاش بولا۔

"کیوں تم کسی اسکول کے ماسٹر صاحب ہو جو تھپڑ لگاؤ گے"۔

چاچو کی بات سن کر سارے بدمعاش ہنسنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے باپ کا بڑا لاڈلا ہے جو اسے ابھی تک باہر کی ہوا نہیں لگی"۔

"ہاں تو ہوا کیسے لگے شیشے تو تم نے چڑھا رکھے ہیں" چاچو نے کہا۔

سارے اغوا کرنے والے ایک بار پھر ہنس پڑے۔ اب تو وہ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ لوگ چاچو کو اغوا کر کے نہیں لے جا رہے، کسی دعوت پر لے جا رہے ہیں۔

"کمال ہے، ہم تمہیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں اور تمہیں کوئی پریشانی نہیں" ایک مجرم نے حیران ہو کر چاچو سے پوچھا۔

"ارے پریشانی کس بات کی؟ انسان روز روز اغوا تھوڑی ہوتا ہے۔ ایسا موقع تو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ میں تو لطف اٹھا رہا ہوں"۔

اسی گپ شپ میں وہ ایک کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا اور گاڑی فوراً اندر چلی گئی۔ دو آدمیوں نے چاچو کو اٹھایا اور ایک کمرے میں موجود لمبے تڑنگے سے آدمی کے سامنے لا پھینکا۔

"شاباش ٹمی، معلوم ہوتا ہے تمہیں آسانی سے کامیابی حاصل ہو گئی ہے"۔

ٹونی نے باس کہا "لیس باس، دیکھیں ہم نے لڑکا ٹھیک پہچانا ہے ناں، کلین شیو بھی ہے، نظر کا چشمہ بھی لگا ہے۔ اس کی گاڑی کا نمبر بھی ہم نے دیکھا بالکل آپ کا بتایا ہوا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے سر پر سندھی ٹوپی بھی ہے۔ واقعی باس ہم نے ایسی ٹوپی کبھی نہیں دیکھی"۔

"باس اس کے تاوان میں جو پیسے ملیں اس میں سے چاہے مجھے حصہ دیں یا نہ دیں مگر یہ ٹوپی مجھے دے دیں۔ ویسے بھی میں نے ہی پومی کے ساتھ مل کر اس کو گاڑی سے اغوا کیا تھا۔ ایک بدمعاش بولا۔

"خبردار، یہ ٹوپی کسی کو نہیں مل سکتی۔ یہ ٹوپی میرے دوست کی امانت ہے"۔ چاچو نے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ تمہارے دوست کی امانت ہے؟" ایک بدمعاش بولا۔ پھر اپنے باس سے کہنے لگا۔ "باس، آپ نے تو کہا تھا کہ ٹوپی شیخ احسان کے بیٹے کی اپنی ہے اور وہ اسے اکثر پروگراموں پر پہنتا ہے"۔

"ہاں ہاں تو کیا تم شیخ احسان کے بیٹے نہیں ہو؟ کیا نام ہے تمہارے باپ کا؟" باس نے پوچھا۔

"باغ علی تھا ان کا نام، بہت عرصہ ہوا فوت ہو چکے ہیں" چاچو نے جواب دیا۔

بدمعاش ہنس پڑے اور باس نے سر پکڑ لیا۔

"ارے یہ کس باغ کے بوٹے کو اکھاڑ لائے ہو تم؟" باس نے اپنے کارندوں سے کہا۔ پھر چاچو سے کہنے لگا "ابے کون ہے تو اور یہ ٹوپی تم نے کہاں سے لی؟"

"یہ ٹوپی میرے دوست افغان احمد کی ہے جو شیخ احسان احمد کا بیٹا ہے اور جس کو یہ بدمعاش بے ہوش کر کے وہیں چھوڑ آئے ہیں"۔

"اف ٹمی گدھے! تم ساری عمر گدھے ہی رہو گے انسان نہیں بن سکتے، یہ کیا کر دیا تم نے؟"

"غلطی ہو گئی باس، معاف کر دیں۔ میں بھی کہوں یہ باتیں کیسی بہکی بہکی کرتا ہے۔ شیخ چلی کی اولاد"۔

"باس، اب اس کے باپ سے تاوان لے لیتے ہیں" ایک بدمعاش نے مشورہ دیا۔

"ارے اس کا باپ ہی مر گیا ہے تاوان کہاں سے دے گا یہ جھینگر، الٹا ہمارا وقت ضائع کرے گا۔ جاؤ دفع کر کے آؤ اسے، کہیں بے ہوش کر کے پھینک آؤ"۔

"ارے اتنی گرمی میں مجھے اٹھا کر لے آئے ہو، کوئی جوس وغیرہ تو پلا دو" چاچو نے کہا۔

"چپ کر! بڑا آیا جوس کا شوقین، کبھی گھر پر بھی پیا ہے؟" باس نے کہا۔ پھر اپنے ایک کارندے سے بولا "پومی، استرا لے کر آؤ۔ اس کو آزاد کرنے سے پہلے ہم اس کو یہاں آنے کی سزا دیں گے"۔

پھر چند لمحوں کے بعد سارا کمرا قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ کیوں کہ کمرے کے عین درمیان میں چاچو چاند کی ٹنڈ ہو رہی تھی اور وہ ڈری ہوئی گائے کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ پھر باس نے چاچو کی نازک سی ٹنڈ پر ایسا مکا رسید کیا کہ وہ مکا لگتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو چاچو ایک ویران سی جگہ پر پڑے تھے۔ جہاں سے وہ گرتے پڑتے شام کو گھر پہنچے۔ چاچو چاند جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ عاصم، قاسم جو صحن میں بیٹھے تھے، چیخ اٹھے۔

"ارے کون ہو تم اور یوں بلا اجازت کیوں گھسے آ رہے ہو؟"

"میں چاند ہوں" چاچو نے روہانسی آواز میں بمشکل کہا۔

"چاچو چاند آپ؟" دونوں حیران ہو کر بولے۔

اتنے میں سب گھر والے اکٹھے ہو چکے تھے اور چاچو چاند انہیں اپنی غم گین داستان سنانے لگے۔ سب کو دکھ تو ہوا کہ چاچو کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ پیش آ گیا مگر اس بات پر سب خوش بھی تھے کہ افغان اور چاچو کی جانیں بچ گئیں۔ بات ختم ہوئی تو قاسم کہنے لگا۔ "چاچو، پہلے تو آپ چاند تھے مگر اب آپ کی گول مٹول چمکتی دمکتی ٹنڈ کو دیکھ کر چاچو سورج کہنے کو جی چاہتا ہے"۔ اور پھر سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

* * *

ہونہار مصور

آتش زدگی کا منظر

محمد عثمان چک 200 آر بی لاٹھیاں والا (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ریشم حفیظ اسلام آباد (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

عاطف فاروق بھلوال (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

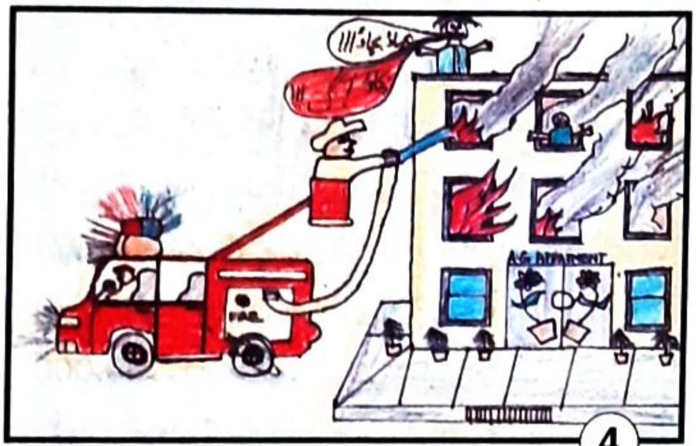

عبدالغنی کراچی (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

شاہد حسین جھنگ صدر (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

ثاقب امجد لاہور چھاؤنی (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: انعم منیر چک لالہ۔ خالد تنزیل بہاول پور۔ محمد حسن علی چنیوٹ۔ آصف الرحمان جھنگ۔ مریم عباس پھالیہ۔ عاطف فاروق بھلوال۔ بلال اکرام بابر چنیوٹ۔ احسن کلیم مقام نہیں لکھا۔ محمد اسلم خان بنوں۔ شائستہ ناز میاں والی۔ شجاعت عباس کراچی۔ تحسین احمد میر پور خاص۔ محمد خالد حسین کوٹ ادو۔ نادیہ خرم جنجوعہ سیال کوٹ۔ حسن میاں والی۔ فاطمہ فرقان کراچی۔ دانیال احمد لاہور۔ ثاقب محمود اعوان اٹک۔ طیب حسن لاہور۔ سائرہ سمیرا سنی عادل شیخوپورہ۔ اویس جہاں گیر لاہور۔ یاسر اختر کراچی۔ محمد علی رفیق لاہور۔ محمد مبین جبار شاہ خلیل۔ شاہان اکبر لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دسمبر کا موضوع: افطاری کا منظر — آخری تاریخ 7 نومبر

جنوری کا موضوع: عید الفطر اور سویاں — آخری تاریخ 7 دسمبر

معلومات

نیپال

ڈاکٹر رضوان ثاقب

یہ وسطی ایشیا کا خشکی سے گھرا ہوا ایک ملک ہے۔ اس کے شمال میں عوامی جمہوریہ چین (تبت) اور مشرق، جنوب اور مغرب میں بھارت ہے۔ اس کا کل رقبہ 54633 مربع میل (140,797 مربع کلو میٹر) ہے۔ شرقاً غرباً 800 کلو میٹر لمبا اور شمالاً جنوباً ڈیڑھ سو سے ڈھائی سو کلو میٹر چوڑا ہے۔ آبادی 21,100,000 نفوس ہے۔ اس کا دارالحکومت کھٹمنڈو ہے۔ دیگر اہم شہروں میں پوکھارا، بیرت نگر اور بیر گنج زیادہ مشہور ہیں۔ سرکاری زبان نیپالی ہے اور تقریباً 80 فی صد لوگ یہی زبان بولتے ہیں جب کہ یہاں دوسری بڑی زبان تبتی ہے۔ اردو اور ہندی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے 90 فی صد لوگ ہندو ہیں اور سرکاری مذہب بھی ہندو ہی ہے جب کہ یہاں کا دوسرا بڑا مذہب بدھ مت ہے۔ مسلمان نیپال کی آبادی کا دو اعشاریہ چار فی صد ہیں۔ نیپال کا سکہ نیپالی روپیہ ہے۔ نیپال دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کا پرچم چوکور شکل میں نہیں۔ نیز یہ دنیا کی واحد ہندو سلطنت ہے اور اس کا شمار دنیا کے غریب ترین ملکوں میں ہوتا ہے۔

ملک کا بیش تر حصہ جنگلوں اور کوہستانی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ دنیا کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ اسی علاقے میں ہے۔ جس کی بلندی 29028 فٹ ہے۔ اسے پہلی بار 1953ء میں سر کیا گیا۔ اس کے علاوہ مکالو، دھول گری اور انا پرنا کی چوٹیاں بھی نیپال میں ہی ہیں جن کا شمار دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں ہوتا ہے۔ یہاں وادیوں میں چاول، پٹ سن، جوار، تمباکو، گندم، چنا اور تیلوں کے بیج کاشت کیے جاتے ہیں۔

یوں تو نیپال کی تاریخ بہت پرانی ہے مگر جدید نیپالی سلطنت کی بنیاد ریاست گورکھا کے ایک حکمران نے اٹھارویں صدی میں رکھی۔ 16-1814ء کے دوران میں نیپال اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں نیپال کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد نیپال اور ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کے مابین تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے اور نیپالی گورکھے ہندوستانی فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے۔

نیپال 14 دسمبر 1955ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ 1991ء تک تو نیپال میں بادشاہت قائم رہی لیکن اس کے بعد پہلی دفعہ جمہوری طرز پر الیکشن کروائے گئے اور اب یہاں ایک جمہوری حکومت قائم ہے۔

نیپال کا سب سے بڑا شہر کھٹمنڈو دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پرانا کھٹمنڈو اور نیا کھٹمنڈو۔ پرانا اور نیا کھٹمنڈو دریائے باگ متی اور دریائے بشنومتی کے سنگم پر آباد ہے۔ نیپال چار قدرتی حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک ترائی کا علاقہ جو انڈیا کی سرحد کے ساتھ ساتھ ہے۔ دوسرا کوہ شوالک کا علاقہ، تیسرا درمیانہ علاقہ یعنی مڈل زون اور چوتھا کوہ ہمالیہ کا علاقہ۔ نیپال کے 56 فی صد لوگ مرکزی نیپال میں رہتے ہیں، 40 فی صد لوگ ترائی کے علاقے میں سکونت پذیر ہیں اور 4 فی صد کھٹمنڈو کی وادی میں

رہتے ہیں۔

نیشنل پارکوں اور پناہ گاہوں کے علاوہ ترائی کے جنگلوں اور دل دلی علاقوں میں چرندوں، پرندوں اور درندوں کا عام شکار ملتا ہے۔ نیپال شکار کے علاوہ ان قلیوں کے لیے بھی دنیا بھر میں مشہور ہے جو کوہ پیماؤں کا بوجھ اٹھا کر ان کے ساتھ پہاڑوں پر جاتے ہیں۔ ان کو شرپا کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ شرپا تنزنگ نے سر ہلارے کے ساتھ مل کر پہلی بار ایورسٹ کی چوٹی کو سر کیا تھا۔

نیپال کے ہر جنگل ہر پارک اور ہر شکار گاہ میں شیر ملتا ہے۔ جنگل میں کسی طرف بھی نکل جائیں شیر کا سامنا ہو سکتا ہے۔ نیپال کی حیثیت ایشیا میں افریقہ کی ہے جہاں ہر طرف شیر ہی شیر نظر آتے ہیں۔ رائل چٹ ون نیشنل پارک یہاں کی مشہور چراگاہ ہے جو 932 مربع کلو میٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں دل دل ہے، لمبی لمبی ہاتھی گھاس ہے اور گھنے جنگل ہیں۔ دراصل رائل چٹ ون نیشنل پارک ایک پیالہ نما بڑے رقبے کا حصہ ہے۔ یہ رقبہ 3800 مربع کلو میٹر ہے جس کے 932 مربع کلو میٹر میں شکار گاہ ہے۔ زمین کے اس پیالے میں دو دریا نارائینی اور ریتی بہتے ہیں۔ اس رقبے کے شمال میں مہا بھارت لیکھ اور جنوب میں شوالک کی پہاڑیاں ہیں۔ دریائے ریتی کے شمالی کنارے پر میگالی کا ہوائی اڈہ ہے۔

رائل چٹ ون نیشنل پارک سرکاری شکار گاہ ہے اور یہاں ہر قسم کا شکار ملتا ہے۔ شیر، چیتا، تیندوا، جنگلی ریچھ، سانبھر ہرن، اود بلاؤ اور پانی کے جانور۔ غرض یہ کہ ہر قسم کا پرندہ چرندہ اور درندہ یہاں دستیاب ہے۔ مگرمچھ، گھڑیال گنگا جمنی ڈولفن، سینکڑوں قسم کی مچھلیاں، مرغابیاں، بگلے، کوٹ، راج ہنس، غرض یہ کہ پانی کا ہر جانور یہاں ملتا ہے۔ جونکوں کی بھی کمی نہیں لیکن وہ برسات میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہونے اور جنگلات کی بہتات کی وجہ سے کوہ پیماؤں اور شکار کے شوقین لوگوں کے لیے یہ ملک بڑی دل چسپی کا حامل ہے۔

نیپال میں مختلف گروہوں کے لوگ آباد ہیں۔ خاص کر شرپا (SHERPA) جو کہ پہاڑوں پر چڑھنے کے فن کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ کوہ پیما اور سیاح انہیں ہی بطور گائیڈ اپنے ساتھ لیتے ہیں۔ گورکھا لوگ اپنی بہادری اور فن سپاہ گری کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ وادی کھٹمنڈو کے نی وارز اپنے دل کش لکڑی کے کام اور لکڑی پر کندہ کاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ نیپالی گھروں اور مندروں کو لکڑی کے کام سے بہت خوب صورتی سے سجاتے ہیں۔

نیپال کے آدم خور

سلیم خان گمی

کئی سال پہلے آدم خور شیر کے شکار کے لیے مجھے نیپال کے وزیراعظم، رانا بکرم بھیشم کی طرف سے دعوت نامہ ملا تھا۔ وزارت عظمیٰ کی سال گرہ منائی جا رہی تھی اور دنیا بھر کے مشہور شکاریوں، حکم رانوں اور سیاست دانوں کو بلوایا گیا تھا۔ نیپال کے وزیراعظم نے اپنے خرچ پر مجھے کھٹمنڈو طلب کیا۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام تھا رانا دھر مہندرا بھیشم۔ دونوں سیاست دان تھے اور دونوں ایک دوسرے کے سیاسی مددگار تھے۔

میں لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی اور دہلی سے کھٹمنڈو پہنچا۔ وزیراعظم کے نمائندے میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مجھے کار میں بٹھا کر ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ وہاں دوسرے ملکوں کے مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ موسم معتدل تھا۔ نہ گرمی نہ سردی۔ اکتوبر کا مہینا تھا۔ ہاں کبھی کبھار دن میں حبس ہو جاتا تھا لیکن بجلی کے پنکھے موجود تھے۔

جس روز میں کھٹمنڈو پہنچا اس کے دوسرے روز وزارت عظمیٰ کی سال گرہ تھی جس کے لیے وزیراعظم رانا بکرم بھیشم اور ان کے چھوٹے بھائی رانا دھر مندرا بھیشم نے خوب انتظام کیا تھا۔ مجھے شاہی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور میری خدمت کے لیے خصوصی طور پر ایک چھوٹے قد اور چپٹی ناک والا گورا چٹا گورکھا الاٹ کیا گیا جو بے حد چست اور چوکنا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرا باڈی گارڈ ہو۔ شام کو وہ ایک آدمی کو میرے پاس لایا جس کا نام فدا محمد تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"سر! آپ کو اس ہوٹل میں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں کوئی تکلیف نہیں شکریہ"۔

"اگر آپ نے مردم خور شیر کو مار دیا تو آپ کو تمغے کے ساتھ ساتھ 5 لاکھ روپے کا انعام بھی دیا جائے گا۔ مہاراجا کی طرف سے شاہی تلوار دی جائے گی" وہ بولا

"دنیا بھر سے بڑے بڑے شکاری آئے ہوئے ہیں۔ دیکھو قسمت کس کا ساتھ دیتی ہے۔ میں اپنے طور پر کوشش کروں گا کہ کسی آدم خور شیر کو نشانہ بنا سکوں" میں نے کہا۔

"آپ رائل چٹ ون نیشنل پارک میں شکار کھیلیں گے۔ اسی پارک میں یورپ اور امریکا کے حکم ران، سیاست دان اور شکاری وزیراعظم رانا بکرم بھیشم کے ساتھ شکار کھیلیں گے" فدا محمد بولا۔ وہ چالیس سال کا صحت مند شخص تھا اور خود شکاری تھا۔

"شکار کا وقت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صبح 10 بجے سے لے کر 5 بجے شام تک، ایک سے دو بجے تک لنچ ہوگا۔ میں واپس جا کر پورا پروگرام آپ کو بھجواتا ہوں" اس نے جھک کر سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے دن مرغ نے اذان دی تھی کہ شکار پارٹی کے اہل کار آ گئے اور مجھے اٹھا کر گرما گرم کافی پلائی گئی، اس کے بعد وہ مجھے لے کر چل دیئے۔ معلوم ہوا کہ رائل چٹ ون پارک کھٹمنڈو سے ایک 120 کلو میٹر دور جنوب مغرب کی طرف ہے۔ وہاں ایک ہوائی اڈا بھی تیار کیا گیا ہے اور ہم وہاں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے جائیں گے اور پھر 50 ہاتھیوں پر سوار ہو کر جنگل میں داخل ہوں گے۔ ان ہاتھیوں کو ہانکنے کے لیے تربیت یافتہ مہاوت یعنی فیل بان ہوں گے جو ہاتھیوں کو قابو میں رکھیں گے۔ اگر شیر حملہ کرے گا تو ہر فیل بان ہاتھی کو مقابلہ کے لیے گائیڈ کرے گا۔ یہ اور ایسی دوسری معلومات اس بروشر میں درج تھیں جو مجھے اس روز صبح سویرے کھٹمنڈو سے روانہ ہوتے وقت تھمایا گیا تھا۔ میں جس ہیلی کاپٹر سے شکار گاہ کے ہوائی اڈے پر آیا تھا اس میں رانا مہندرا بھیشم بھی تھا یعنی وزیراعظم نیپال کا چھوٹا بھائی۔ ہمارا ہیلی کاپٹر سب سے پہلے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس کے بعد کئی دوسرے ہیلی کاپٹر آئے۔ رانا مہندرا نے تمام معزز مہمانوں کا استقبال کیا اور منہ ہاتھ دھونے اور ناشتہ کے لیے ان کو ایک عارضی ہوٹل کے مختلف کمروں میں لے گئے۔ یہ دراصل ہوٹل نہ تھا ایک بڑا ریسٹ ہاؤس تھا۔ اسی ریسٹ ہاؤس

میں مجھے فدا محمد ملا۔ وہ مجھے اس سے پہلے کھٹمنڈو میں مل چکا تھا۔ اس نے شکار کے لیے ہتھیار سجائے ہوئے تھے۔

دوپہر سے پہلے، ٹھیک 10 بجے ہانکا شروع ہوا۔ 500 آدمی ڈھول تاشے اور کھڑتالیں بجانے لگے اور ساتھ ساتھ منہ سے شور مچانے لگے۔ ڈھول تاشوں اور ہانکا لگانے والوں کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ تربیت یافتہ تھے۔ کئی نسلوں سے یہی کام کرتے چلے آرہے تھے۔ شکاری 50 ہاتھیوں پر ہتھیار بند بیٹھے تھے اور شکار کے لیے ہر طرح تیار تھے۔

ان ہاتھیوں کے فیل بان بھی چاق و چوبند تھے اور ان کی آنکھیں اپنے سامنے گھنے جنگل پر لگی ہوئی تھیں۔ ہاتھی گھاس اور درختوں کی شاخوں اور پتوں میں سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان کے کان بھی ہر سرسراہٹ کو توجہ سے سن رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہانکا کرنے والوں کے شور و غل کے سامنے سرسراہٹوں کا پتا لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لگتا تھا سینکڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی شکار گاہ جنگ کا میدان بن گئی ہے۔ انسان اور حیوان کی جنگ اس جنگ...... میں درخت، دریا، جھیلیں، دلدلیں، پہاڑیاں حتیٰ کہ گھاس پات بھی حصہ لے رہے تھے۔

میرا ہاتھی رانا دھر مہندرا بھیشم کے ہاتھی سے کچھ دور کھڑا تھا۔ دھر مہندرا کے ہاتھی کا مہاوت تجربہ کار دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر 40 سال کے قریب ہو گی۔ میرا فیل بان کم عمر تھا۔ اس کی عمر 30 سال ہو گی۔ میرے پاس بندوق بھی تھی اور خنجر بھی۔ دھر مہندرا کے پاس ان دو ہتھیاروں کے علاوہ تلوار اور نیزہ بھی تھے۔ ہانکا کرنے والوں کے شور کے ساتھ ساتھ اب فائرنگ بھی شروع ہو گئی تھی۔ فائرنگ بھی ہانکا کا حصہ تھی تاکہ اس سے شیر چیتوں کو ڈرا دھمکا کر شکاریوں کی طرف لایا جائے۔ یہ بندوقوں کی فائرنگ نہ تھی، ریکلے چلائے جا رہے تھے۔

اچانک درختوں کے جھنڈ سے چیخیں اٹھیں اور سارے جنگل پر چھا گئیں۔ ہانکا بدستور جاری تھا لیکن یہ چیخیں ہانکے کے شور کے باوجود سنائی دیں۔ میں نے اپنے فیل بان سے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولا "صاحب! مجھے نہیں پتا" پھر اس نے رانا دھر مہندرا بھیشم کے فیل بان سے پوچھا تو اس نے کہا "شیر پلٹا ہے اور اس نے ایک آدمی کو پنجہ مارا ہے۔ شیر بھاگ گیا ہے اور آدمی مر گیا ہے"۔ اسے یہ بات رانا دھر مہندرا نے بتائی تھی جس کے پاس دوربین تھی۔ مرنے والا شکاری اس مہم کا پہلا شکار تھا۔ بے چارہ!

میں نے اپنے فیل بان سے کہا کہ وہ اپنے ہاتھی کو رانا دھر مہندرا کے ہاتھی کے پاس لے جائے۔ وہ ہاتھی کو ہانک کر اور ہدایات دے کر دھر مہندرا کے پاس لے گیا۔

"رانا صاحب! ہم ہاتھیوں پر بیٹھے رہیں گے یا آگے بڑھیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اصول یہ ہے کہ ہم کھڑے رہیں۔ شکار چل کر ہمارے پاس آئے تو ہم گولی چلا کر یا نیزے خنجر سے اسے ہلاک کر دیں" وہ بولا۔

"اصول تو واقعی یہی ہے لیکن ہانکا آگے نہیں بڑھ رہا۔ بہت سست ہے"۔ اس نے شکایت کی۔

"دراصل جنگل بہت گھنا ہے اور پھر ہانکا لگانے والے ڈرے ہوئے بھی ہیں۔ ان کا ایک ساتھی مر گیا ہے اور ان کو معلوم ہے کہ اس شکار گاہ میں کئی مردم خور شیر پائے جاتے ہیں جو ذرا نہیں ڈرتے اور حملہ کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں جس شیر نے ابھی ابھی ایک آدمی کو ہلاک کیا ہے وہ بھی مردم خور شیر تھا"۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ درخت پر سے چتکبرے جنگلی چیتے نے چھلانگ لگائی اور دھر مہندرا کے دائیں جانب کا رخ کیا اور مارتھا کے فیل بان پر حملہ آور ہوا۔ وہ فیل بان پر نہ گرا ہاتھی کی سونڈ پر گرا۔ ہاتھی گھبرایا اور اگلے دو قدم اٹھا کر پلٹا اور ساتھ ساتھ چیخنے لگا۔ ہاتھی کی چیخوں کے ساتھ مارتھا بھی گھبرا کر چیخنے لگی۔ ہاتھی اب قطار چھوڑ کر واپس جا رہا تھا اور رانا دھر مہندرا فیل بان سے کہہ رہا تھا کہ میاں بیوی کو ریسٹ ہاؤس

لے جاؤ تاکہ آرام کریں' وہ گھبرا گئے ہیں۔ جارج اور مارتھا لندن سے آئے تھے اور وزیراعظم نیپال کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔

ہانکا اب قریب آرہا تھا۔ ہانکے کے شور و غل میں اصلی فائرنگ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا ایک شیر چت ہو گیا ہے۔ بتایا گیا کہ شیر کو تبت کے مہاراجا نے مارا ہے۔ ہم تبت کے شکاری کو داد دے رہے تھے کہ سامنے سے جنگلی ہاتھی لہراتا ہوا آیا اور رانا دھر مہندرا کے ہاتھی کی طرف بڑھا۔ اس نے تابڑ توڑ بندوق سے فائر کئے اور ہاتھی چیختا چنگھاڑتا پہاڑ کی طرح گر پڑا۔ میں نے رانا کو شاباش دی۔

درندے اب شکاریوں کے قریب آرہے تھے۔ ہاتھی ان میں پہلا درندہ تھا جو رانا کی گولی کا نشانہ بنا۔ ہماری بائیں جانب گولی چلنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ جنگلی ریچھ شکار ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے سر پر سے پہاڑی کوؤں کا قافلہ گزرا۔ وہ کائیں کائیں کرتے ہوئے جنگل کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ہرنوں کی ایک قطار بھاگتی ہوئی دکھائی دی لیکن کسی شکاری نے گولی نہ چلائی۔ کیوں کہ وہ سب شیر شکار کرنے آئے ہوئے تھے نہ کہ ہرن۔ ایک شکاری نے ایک مگرمچھ کو ڈھیر کیا۔ مگرمچھ آدھا دل دل میں تھا اور آدھا دل دل سے باہر۔ ایسے چھوٹے چھوٹے شکار آدم خور شیر کے شکار کا حصہ تھے۔

ایک بجے ہانکا ختم ہو گیا کیوں کہ ایک سے دو بجے تک کھانے کا وقت طے ہوا تھا۔ مہمانوں کے لیے کھانے کا معقول انتظام تھا۔ ہاتھیوں کے لیے چارے پانی کا اور ہانکا کرنے والوں کے لیے وہیں پر دال بھات پکانے کے لیے دیگیں پکائی گئی تھیں۔ چشمے کا پانی تھا۔ 500 مزدور جو ہانکا کے لیے بلوائے گئے تھے۔ رکابیاں اور گلاس گھروں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ لوگ شکار گاہ سے زیادہ دور نہ رہتے تھے اور نیپال کی سیاحت کا ایک لازمی حصہ تھے۔

دو بجے دریا کی دوسری جانب ہانکا کا انتظام ہوا۔ اب کے بھی پہلے کی طرح ہاتھیوں کی قطار کھڑی کی گئی۔ شکاری اور فیل بان سوار ہوئے۔ کچھ شکاری پیدل تھے جو دراصل شکاری کم اور محافظ زیادہ تھے۔ رانا دھر مہندرا کا محافظ پہلے کوئی اور تھا لیکن اب فدا محمد تھا۔ میرا اور رانا کا ہاتھی ساتھ ساتھ یعنی پہلے کی طرح ایک دوسرے کے قریب تھے۔ جارج اور مارتھا کا ہاتھی قطار میں شامل تھا۔ وہ تازہ دم ہو کر پھر آگئے تھے۔ جو ہانکا 2 بجے شروع ہوا اسے 5 بجے ختم ہونا تھا لیکن ہانکا کرنے والوں کا جوش و خروش اب دیدنی تھا۔ لگتا تھا وہ 2 گھنٹے کے اندر اندر شکار گاہ کے سارے شیر چیتے ہاتھی ریچھ وغیرہ شکاریوں کے سامنے قطار اندر قطار لا کھڑے کر دیں گے تاکہ وہ ان کو گولیوں کا نشانہ بنا سکیں۔ جانور تو پہلے سے پریشان تھے' وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے شکاریوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رانا نے اپنی دوربین سے شیر کو دیکھا اور فیل بان سے کہا کہ ہاتھی کو اس کی طرف بڑھائے۔

فیل بان نے حکم مانا اور ہاتھی کو شیر کی جانب ہانکنے لگا۔ فدا محمد نے مجھے آواز دی اور کہا "سر! آپ بھی اپنا ہاتھی آگے بڑھائیں' شیر کی طرف"۔ چناں چہ میں نے بھی اپنے مہاوت سے کہا کہ وہ آگے بڑھے۔ اب دونوں ہاتھی آگے بڑھنے لگے' اچانک درختوں جھاڑیوں اور ہاتھی گھاس سے ایک شیر نے چھلانگ لگائی اور رانا سے ٹکرایا۔ رانا سنبھل نہ سکا۔ ہاتھی پر سے لڑھکا تو تلوار بندوق نیزہ وغیرہ گر پڑے۔ صرف ایک خنجر ان کے پاس رہ گیا جو نیفے میں اڑسا تھا۔ شیر نے ایسا پنجہ جمایا تھا کہ ہودج زمین پر آرہا۔ فیل بان چیختا چلاتا چیختے چنگھاڑتے ہاتھی کو لے کر ایک طرف ہو گیا اور پھر درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں نظر نہ آیا۔

اب ہاتھی گھاس میں سوکھے سڑے اور گیلے پتوں پر رانا تھا اور شیر تھا۔ دونوں کا مقابلہ برابر نہ تھا۔ کہاں شیر اور کہاں ایک انسان؟ لیکن رانا جوان تھا بہادر تھا اور نڈر تھا۔ خنجر لیے پشت کے بل زمین پر گرا شیر کا مقابلہ کر رہا تھا۔ فدا محمد نے شیر کو ڈرانے کے لیے پہلے ہوائی فائر کیا اور اس کے بعد شیر کا نشانہ لیا لیکن نشانہ چوک گیا مگر دونوں فائروں کا اثر ضرور ہوا۔ شیر ذرا گھبرایا اور رانا نیچے سے نکل کر شیر کے اوپر آگیا۔ اب رانا شیر پر خنجر سے حملہ کر رہا تھا لیکن وار کڈھب پڑتا تھا۔ تاہم رانا شیر کے پنجوں کی سخت ضربوں سے محفوظ تھا۔ لیکن کب تک؟ کسی وقت بھی شیر پنجہ مار

کر رانا کا کام تمام کر سکتا تھا۔ فدا محمد کے لیے اب ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ شیر کو بندوق کی گولی کا نشانہ بنائے کیوں کہ شیر کے اوپر تو رانا تھا جو گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ چناں چہ فدا محمد ہوائی فائرنگ کرتا رہا۔ معلوم نہیں اس کے پاس خنجر تھا یا نہیں لیکن اس نے خنجر یا نیزے سے شیر پر حملہ نہ کیا اور دور کھڑا گولیاں ضائع کرتا رہا۔

میں نے اپنے بھاگتے ہوئے ہاتھی سے چھلانگ لگائی اور رانا کو چھڑانے اور شیر کو مارنے کے لیے شیر کا نشانہ لیا۔ اسے اتفاق سمجھئے کہ میری دونوں گولیاں کارگر ثابت ہوئیں۔ ایک گولی شیر کے جبڑے کو چیرتی ہوئی نکل گئی اور دوسری گولی نے شیر کی کھوپڑی کو چور چور کر دیا۔ فیل بانوں کی چیخ و پکار ہاتھیوں کے چنگھاڑنے اور فدا محمد اور میری گولیوں کی تڑتڑ سے خوب شور اٹھ رہا تھا۔ انگریز شکاری الگ شور مچا رہے تھے۔ اس ماحول میں میں نے آگے بڑھ کر رانا کو اٹھایا۔ اس کا بایاں بازو اور دائیں ٹانگ شیر کے پنجے سے زخمی تھے اور ان میں سے خون رس رہا تھا۔ ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ تاہم رانا بے ہوش نہیں تھا۔ وہ میرے کندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ ہانکا کا شور پہلے کی طرح تیز اور شدید تھا۔

میں رانا کو سنبھال رہا تھا کہ فدا محمد چلایا "شیر آگیا! شیر آگیا!!" میں نے رانا سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ واقعی شیر لپکا چلا آ رہا تھا۔ بندوق کندھے پر لٹک رہی تھی لیکن شیر تو گولی کی سی تیزی سے ہم دونوں کی طرف اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ میں نے زور سے کہا "رانا بیٹھ جاؤ" رانا کے ساتھ میں بھی زمین پر بیٹھ گیا اور خنجر دائیں ہاتھ میں لے کر شیر کے راستے میں گھٹنوں کا سہارا لے کر خنجر کو اوپر کر دیا۔ خنجر کی نوک اب شیر کے پیٹ کی طرف تھی۔ شیر کا پیٹ خنجر کی نوک سے ٹکرایا اور پورا خنجر شیر کے پیٹ میں دھنس گیا۔ چھلانگ کے زور سے شیر دو گز کے فاصلہ پر گرا۔ اس کا پیٹ چاک ہو چکا تھا اور انتڑیاں باہر آگئی تھیں۔ خنجر اب بھی میرے ہاتھ میں تھا لیکن گرم گرم خون سے شرابور۔ شیر دھاڑا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے پیٹ میں ایک فٹ چیر آگیا تھا اور خون دھار کی طرح نچڑ رہا تھا۔ میں نے بندوق کے دو تین فائر کیے اور اسے ٹھنڈا کیا۔

اسی دوران میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ وزیراعظم کا چھوٹا بھائی آدم خور شیر کے پنجہ سے مارا گیا ہے لیکن وہ تو زندہ تھا۔ سرکاری ڈاکٹر جو ڈیوٹی پر تھا اسی وقت آیا مرہم پٹی ہوئی اور اسے خصوصی ہیلی کاپٹر سے کھٹمنڈو بھجوا دیا گیا۔ ڈاکٹر، میں، فدا محمد اور وزیراعظم خود اسی ہیلی کاپٹر کے ذریعے شکار سے واپس آئے۔ وزیراعظم نے مجھے ایک ماہ تک پاکستان نہ آنے دیا۔ بہت محبت کی اور جب میں واپس آیا تو میرے پاس دو آدم خور شیر ہلاک کرنے پر 5 لاکھ روپے، شاہی تلوار اور سرٹی فکیٹ تھے۔ وزیراعظم نے مجھے 5 لاکھ روپے الگ دیئے تھے جو میں نے فدا محمد کو دے دیئے کہ کھٹمنڈو میں مسلمان بچوں کے لیے اسکول کھولا جائے۔

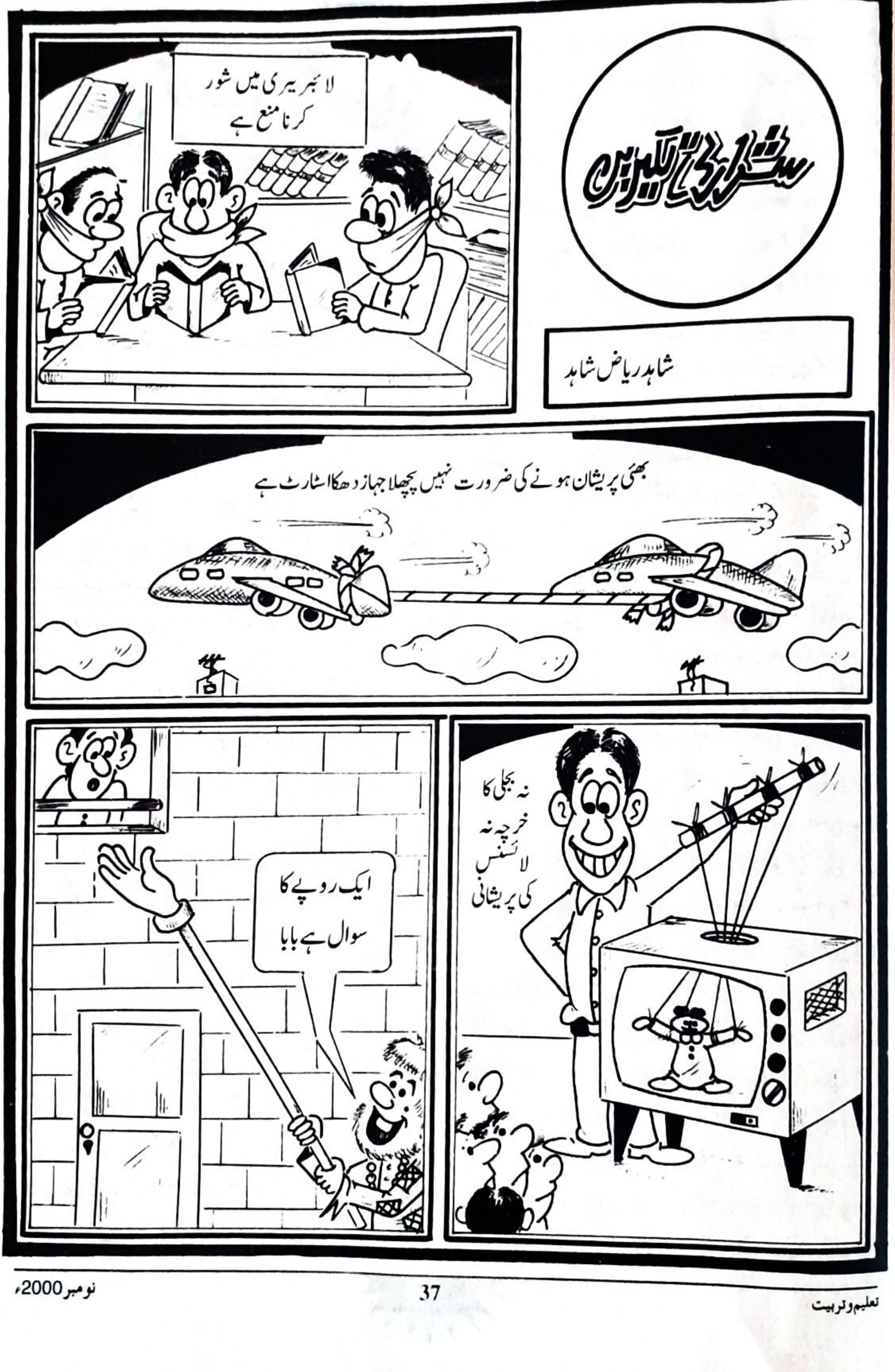

لائبریری میں شور
کرنا منع ہے
شاہد ریاض شاہد
بھئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پچھلا جہاز دھکا اسٹارٹ ہے
نہ بجلی کا
خرچہ نہ
لائسنس
کی پریشانی
ایک روپے کا
سوال ہے بابا

نجمہ معراج

جھیلو جھیلو جھیلو

یہ ایک عام قصبوں کی طرح کا قصبہ تھا مگر اس قصبے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں ایک نواب رہتا تھا جس کی کوٹھی قصبے کے تمام گھروں اور مکانوں سے زیادہ خوب صورت اور عالی شان تھی۔ نواب کے گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کی شرافت کی شہرت بھی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پولیس بھی اس کی شرافت کی وجہ سے اس کی عزت کرتی تھی۔

چوڑا چکلا جسم سفید شلوار قمیص' موٹی موٹی آنکھیں اور سر پر کروشیے سے بنی ہوئی جالی دار ٹوپی نواب کی متانت میں اضافے کا باعث تھی۔ اس کی آمدن کا ظاہری ذریعہ تو مال مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا تھا مگر جس قدر وہ ٹھاٹھ سے رہ رہا تھا اتنی زیادہ کمائی اس ذریعہ سے ہرگز ممکن نہ تھی۔ یہ دولت کی ریل پیل کوٹھی 'کاریں' بنگلہ نواب نے کہاں سے حاصل کیا تھا اور نواب اور نواب کے بیٹے کی شاہ خرچیوں کے لیے پیسا کہاں سے آتا تھا؟ اس بات کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔

جس قصبے میں نواب رہتا تھا اس کے شمال کی طرف ایک بڑی سڑک تھی اور اسی طرح جنوب کی طرف سے بھی ایک بڑی سڑک گزرتی تھی۔ ان دونوں سڑکوں کو ملانے والی ایک چھوٹی مگر لمبی سڑک تھی جس کے کنارے نواب کا یہ قصبہ آباد تھا۔

چھوٹی سڑک کے ساتھ ساتھ گھنے درخت تھے۔ جہاں سے اگر کوئی دن کو بھی سڑک پر سے گزر رہا ہو تو مشکل سے دکھائی دیتا تھا۔ کیوں کہ درختوں نے قد آور ہو کر اوپر سے ایک دوسرے کے ساتھ سر ملا لئے تھے اور سڑک ان کے بیچوں بیچ سرنگ کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ وہ سڑک کیا تھی جنگل میں سے گزرنے والا ایک خوف ناک راستہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ اردگرد کے لوگ سورج غروب ہوتے ہی وہاں سے گزرنے سے ڈرنے لگتے تھے۔ جہاں پر اس چھوٹی سڑک پر آنے کے لیے راستہ نکلتا تھا وہاں دونوں طرف ایک ایک ہوٹل تھا اور چند مشروبات اور پھل وغیرہ کے ٹھیلے بھی وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان ہوٹلوں سے کھانے کے علاوہ مسافروں کی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بوتلیں' چائے' بسکٹ اور جوس وغیرہ بھی مل جاتے تھے۔ خاص کر ڈرائیور حضرات وہاں ٹھہر کر چائے ضرور پیتے۔ یہ دونوں ریسٹورنٹ نواب کے تھے۔ اس کے ملازم ہی ان پر کام کرتے تھے۔ قصبے سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر جہاں اس کی کاشت والی زمین تھی' نواب نے اپنا ڈیرہ بنا رکھا تھا اور وہاں کچھ آدمی کھیتی باڑی اور مویشیوں کو چارہ ڈالنے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔

نواب زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہتا۔ اس نے وہاں کوئی عارضی سا مکان بنانے کے بجائے ایک بہت نفیس گھر تعمیر کرایا تھا جس میں اس کی سہولت کا ہر سامان موجود تھا۔ وہاں سردیوں میں ہیٹر اور گرمیوں میں اے سی چلتا تھا۔ تین ٹیلی فون کنکشن لگائے ہوئے تھے۔ نواب کا موبائل فون ان تینوں سے الگ تھا۔ نواب کا کمرا اٹیچ باتھ تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا کمرا تھا جس میں کم از کم بیک وقت کوئی چالیس پچاس چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ اس وسیع وعریض کمرے میں نواب کے سب کارندے رہتے تھے۔

اصل میں نواب ایک بہت بڑا راہ زن تھا۔ اس بات سے نہ لوگ واقف تھے اور نہ پولیس۔ جو ریسٹورنٹ نواب نے بنوا رکھے تھے وہ اس کے جاسوسوں اور مخبروں کے اڈے تھے جو نواب کو ہر آنے جانے والے کی مخبری کرتے تھے۔ مویشیوں کو چارہ ڈالنے والے کارندے مویشیوں کو چارہ ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ اس نے تو یہ راہ گیروں کو لوٹنے اور قتل کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے ایسے ہی تھے جیسے یہ سارا دن مویشیوں کو چارہ ڈال کر حلال کی روزی

کماتے ہوں حال آں کہ جہاں ضرورت کی ہر سہولت موجود ہو وہاں صرف 15 چوپایوں کے لیے 20 ملازم کون بے وقوف رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو اور پولیس کو بڑی صفائی سے دھوکا دے رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا اصل دھندا مویشیوں کو چارہ ڈالنا اور ریسٹورنٹ چلانا نہیں بلکہ لوگوں کو لوٹنا اور قتل کرنا ہے۔

ریسٹورنٹ پر اس نے اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے تھے۔ جن کا کام یہ پتا لگانا ہوتا تھا کہ کس مسافر کے پاس کتنے پیسے ہیں اور کون کون سی موٹر گاڑیاں کس وقت گزرتی ہیں؟ اس کام کے لیے نواب نے اپنے دو کارندوں کو تیز رفتار موٹر سائیکل بھی لے کر دیئے تھے۔ موٹر سائیکلوں والے کارندے ظاہر یہ کرتے تھے کہ ہم نواب کے کہنے پر شہر کا چکر لگاتے ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کی نشان دہی کر کے پولیس کی مدد کرتے ہیں۔ حقیقت میں سوائے ایک دو نہایت شریف لوگوں کے آج تک کبھی کسی مجرم کی نشان دہی نواب کے کارندوں نے نہ کی تھی۔

جونہی کوئی راہ گیر، جس کے پاس بہت زیادہ پیسے ہوتے، ادھر سے گزرتا تو نواب کے کارندے اسے نہایت صفائی سے لوٹ لیتے اور نام کسی اور شریف آدمی کا لگا دیتے جس کا لوٹ مار سے دور پار کا تعلق واسطہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یوں سارا پیسا نواب کی جیب میں چلا جاتا اور پولیس اصل مجرموں کو تلاش کرتی رہ جاتی۔ جب کہ نواب کی نیک نامی اور خدمت خلق اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے چرچے اور بھی دور دور تک پھیل جاتے تھے۔

جھاڑیوں میں چھپ کر نواب کے کارندے اب تک بیسیوں وارداتیں کر چکے تھے لیکن پولیس کو اصل مجرم کی خبر تک نہ ہوتی تھی۔ نواب کے بندے بظاہر تو اس علاقے کے پہرے دار تھے۔ پولیس اور عوام ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ نواب بہت شریف انسان ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ اس علاقے میں کوئی چوری اور ڈاکہ نہ ہو۔ وضع قطع سے بھی شریف اور ذہین انسان لگتا ہے۔ کبھی اس نے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ نیچی نگاہیں کر کے چلتا ہے۔ بوڑھوں کو ہاتھ پکڑ کر ان کی منزل تک چھوڑ کر آتا ہے۔ راہ چلتے سلام میں پہل کرتا ہے۔ جمعہ کے روز مسجد میں نماز جمعہ کے لیے سب سے اگلی صف میں کھڑا ہوتا ہے۔

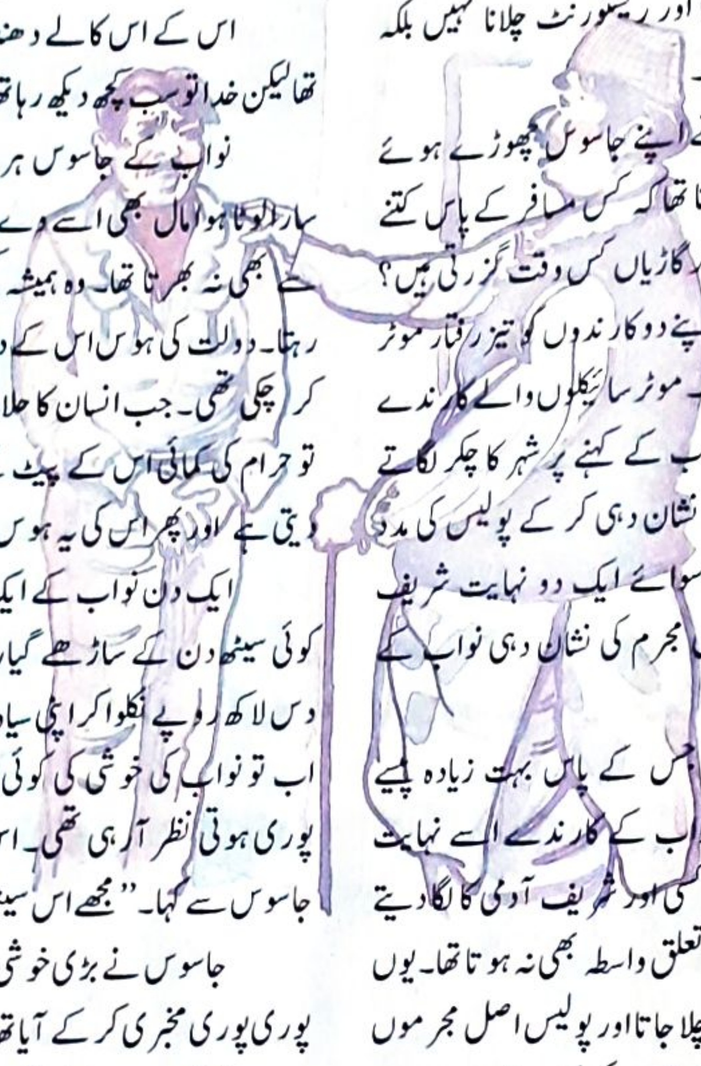

اس کے اس کالے دھندے کا لوگوں کو کچھ علم نہیں تھا لیکن خدا تو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

نواب کے جاسوس ہر بات نواب کو آکر بتاتے اور سارا لوٹا ہوا مال بھی اسے دے دیتے تھے مگر نواب کا جی اس سے بھی نہ بھرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی موٹی مرغی کی تلاش میں رہتا۔ دولت کی ہوس اس کے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ گھر کر چکی تھی۔ جب انسان کا حلال کی کمائی سے دل نہیں بھرتا تو حرام کی کمائی اس کے پیٹ کے دوزخ کی آگ کو اور بھڑکا دیتی ہے اور پھر اس کی یہ ہوس ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

ایک دن نواب کے ایک جاسوس نے آکر بتایا کہ آج کوئی سیٹھ دن کے ساڑھے گیارہ بجے قریبی شہر کے بنک سے دس لاکھ روپے نکلوا کر اپنی سیاہ گاڑی پر یہاں سے گزرے گا۔ اب تو نواب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے اپنی خواہش پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنے اس خاص راز دان جاسوس سے کہا۔ ''مجھے اس سیٹھ کا پورا حلیہ بتاؤ''۔

جاسوس نے بڑی خوشی سے سیٹھ کا حلیہ بتایا کیوں کہ وہ پوری پوری مخبری کر کے آیا تھا۔

''نوجوان سیٹھ کا جسم درمیانہ ہے، یعنی نہ زیادہ موٹا ہے اور نہ پتلا، گورا چٹا رنگ ہے۔ سیاہ کالے گھنگرالے بال ہیں اور وہ سیاہ رنگ کی لمبی سی کار میں ہوگا۔ نواب جی، میں نے نوٹ کیا ہے کہ یہ سیٹھ اکثر سفید سوٹ اور کالے رنگ کی ویسکوٹ پہنتا ہے۔ آج بھی شاید وہ یہی لباس پہنے ہوئے ہو''۔

اب نواب نے اپنے اس خاص جاسوس سے سرگوشی میں کہا۔ ''دیکھو، اتنی بڑی رقم ہمیں اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ رقم چھیننے کے بعد سیٹھ کو قتل بھی کر دیا جائے۔ مگر اس کام کے لیے ہم اپنے نئے ملازم کالو کو

منتخب کرتے ہیں جو اٹک سے ہمارے پاس آیا ہے۔ اب کالو کو سیٹھ کا پورا حلیہ سمجھا دیا گیا۔ نواب کے ذہن میں یہ تھا کہ جونہی کالو یہ واردات کر چکے تو اس کو بھی موقع پر ہی ہلاک کر دیا جائے اور پولیس کو یہ بتایا جائے کہ چند ڈاکوؤں نے یہ واردات کی۔ نواب کے ایک ملازم نے مزاحمت کرنا چاہی تو ڈاکوؤں نے اسے بھی ہلاک کر دیا اور وہ رقم لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

منصوبہ نواب کے ذہن میں تیار ہو چکا تھا۔ کالو کو کار کا رنگ اور سیٹھ کا حلیہ اور ٹائم بھی بتا دیا گیا تھا۔

اب کالو گھات لگائے اپنے شکار کے انتظار میں درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کی اپنی موت بھی چند قدموں کے فاصلے پر نواب کی صورت میں گھات لگائے بیٹھی ہے۔ گیارہ بجے کا وقت ہوا۔ جاسوس کے بتائے گئے حلیے کے مطابق کالی لمبی سی گاڑی میں سفید سوٹ اور سیاہ ویسکوٹ پہنے ایک گورا چٹا نوجوان تنگ سڑک پر نمودار ہوا۔ کالی ویسکوٹ اور سفید سوٹ سے کالو کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ یہ یقیناً سیٹھ ہی ہے۔ جونہی گاڑی اس کے قریب آئی' کالو نے ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ گولی سیٹھ کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی۔

وہ شکاری تو پہلے ہی رہ چکا تھا۔ نشانہ بازی میں بڑا ماہر تھا۔ آج تک اس کا کبھی کوئی نشانہ خطا نہ ہوا تھا۔ بھلا وہ اس شکار کو کیسے بچ نکلنے دے سکتا تھا۔ دوسری طرف نواب بھی فائر کی آواز سن کر خوش ہو رہا تھا کہ کالو کامیاب واردات کر چکا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چند منٹوں میں ہی کالو لاکھوں روپے لے کر یہاں سے گزرے گا اور پھر میری گولی کا شکار ہو کر وہ لاکھوں روپے میرے نام کر جائے گا۔ جیب بھی خوب بھاری ہو جائے گی۔ پولیس اور عوام کے سامنے میری نیک نامی کے چرچے بھی ہوں گے۔

دولت کی ہوس نے شاید اس کے خون کو اس قدر سفید کر دیا تھا کہ اسے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کالو کا فائر کس کی بساط الٹ گیا ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اور آج شاید یہ نواب پر برس کر ہی رہنی تھی اور پھر اس لاٹھی کے درد نے اسے تاحیات تڑپائے رکھنا تھا۔

آج صبح آٹھ بجے سیاہ لمبی گاڑی میں سفید سوٹ اور کالی ویسکوٹ پہنے نواب کا گورا چٹا اکلوتا بیٹا گھر سے نکلا تھا۔ وہ پہلے تو سرخ گاڑی استعمال کرتا تھا مگر آج بدقسمتی سے سیاہ گاڑی لے کر گیا تھا۔ نواب کا بیٹا اپنے کسی دوست سے ملنے شہر گیا تھا اور اب 11 بجے واپس لوٹ رہا تھا۔ کالو چونکہ نواب کے پاس نیا نیا آیا تھا اس لیے اسے نواب کے بیٹے کی پوری شناخت بھی

نہ تھی' اس کے علاوہ درختوں کے گھنے سائے کی وجہ سے یہ کام اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے اس پہچان کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ نواب کا اکلوتا بیٹا خون میں لت پت تھا اور کالو نہایت پھرتی کے ساتھ اس کی جیبیں ٹٹول رہا تھا کہ یہ لاکھوں روپے کی مرغی ہے۔ مگر وہ حیران اس بات پر تھا کہ اس کی جیب سے تو چند ہزار سے زیادہ نہیں نکلے۔

اب وہ مزید کوئی وقت ضائع کئے بغیر نواب کے ڈھیرے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ کیوں کہ اسے علم تھا کہ اس قتل پر اسے نواب ہی تحفظ فراہم کرے گا۔ جب عین اس موڑ پر آیا جہاں نواب گھات لگائے بیٹھا تھا تو نواب رائفل لیے نمودار ہوا۔ ''کالو بھاگ سکتے ہو تو بھاگ لو' اب تم میری گولی سے بچ کر کہیں نہیں جا سکو گے۔ میرے لیے اب تم فاضل پرزہ ہو۔ میں اپنا کام لے کر فاضل پرزوں کو اسی طرح ضائع کر دیتا ہوں اور پھر یہی فاضل پرزے ضائع ہو کر بھی میری نیک نامی میں اضافہ کر جایا کرتے ہیں' ہاہاہاہا!!!!'' یہ کہ کر نواب نے لب لبی پر اپنا دباؤ بڑھایا مگر دوسرے ہی لمحے وہ معجزہ ہو گیا جس کا کالو کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بندوق خراب ہو چکی تھی' اس لیے کالو پر نواب کی گولی نہ چل سکی۔

کالو چاہتا تو اتنی دیر میں اپنی رائفل میں کارتوس ڈال کر چودھری کا کام تمام کر دیتا مگر نہ جانے اس کے ذہن میں کیا بات آئی کہ وہ ایسا کرنے کے بجائے چند ہزار روپے لے کر ہی فرار ہو گیا اور نواب ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ابھی تو اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کا صرف یہ شکار ہی خالی نہیں گیا بلکہ وہ خود بھی اپنے اس گھناؤنے منصوبے کا شکار ہو چکا ہے جو وہ ہمیشہ دوسرے ہنستے بستے لوگوں کو دکھی کرنے کے لیے بنایا کرتا تھا۔

اب کالو سیدھا پولیس اسٹیشن جا کر اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ نواب کے اس کالے دھندے کا پول بھی کھول چکا تھا۔ پولیس نے کالو کو ساتھ لے کر نواب کے ڈھیرے پر چھاپا مارا تو نواب کے گھر صف ماتم بچھی دیکھ کر حیران رہ گئی۔

نواب کا اکلوتا بیٹا سدا کی نیند سو کر نواب کو اس کے گناہوں کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سزا دے گیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف سیٹھ کسی ہنگامی میٹنگ کی وجہ سے بنک سے اپنی رقم نکلوا کر اس راستے سے گزر نہ سکا تھا۔ نواب اور اس کے سارے کارندے گرفتار ہو چکے تھے اور چند روز حوالات میں رہنے کے بعد عدالتی کارروائی مکمل ہونے پر جیل جا چکے تھے۔

اب نواب کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو رہتے ہیں اور وہ یہی کہتا ہے کہ زمانہ اب مجھے جتنی بڑی سزا مرضی دے لے وہ کم ہے۔ جو سزا مجھے میرے خدا نے دی ہے اس سے بڑی کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ وہ نیم پاگلوں کی طرح اکثر یہ کہتا ہے: ''میں کیسا بدبخت ہوں کہ میں نے خود ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل کروانے کے منصوبے بنا کر کالو کو روانہ کر دیا تھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے بندوق اس کو پکڑائی تھی۔ کیا کوئی انسان بھی ایسا کرتا ہے؟''

پھر وہ خود ہی اپنے اس سوال کا پاگلوں کی طرح جواب دیتا ہے۔

''نواب' دوسروں کی اولاد کو قتل کرنے سے بھی ان کے والدین کو اتنا ہی دکھ ہوتا تھا جتنا صدمہ آج تمہیں پہنچ رہا ہے۔ تم نے آج تک بیسیوں انسانوں کو دکھی کیا ہے۔ تیری اس لوٹ مار کی وجہ سے کسی کا بیٹا تعلیم سے رہ گیا' کسی کی بیٹی بن بیاہی رہ گئی' کسی کا لخت جگر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب ان گناہوں کی سزا تجھے ملنی چاہیے تھی۔ یہ سزا تیرے لیے کم ہے' اتنے زیادہ جرائم کی سزا اتنی تھوڑی؟ ہاں یہ تو ابھی بہت کم ہے۔ تم اس قہقہے بہت زیادہ سزا کے مستحق ہو''۔

پھر وہ پاگلوں کی طرح زور سے قہقہے لگاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو کاٹتا ہے۔ زندگی بھر کے جرائم ظلم اور زیادتیاں پچھتاؤں کی صورت میں جب اس کے ذہن کے گرد گھیرا بنا لیتی ہیں تو وہ پھر اعتراف جرم کرتے ہوئے یوں خود کلام ہوتا ہے۔

''نواب' تم نے کتنے لوگوں کو دکھی کیا ہے۔ اب خود یہ دکھ جھیلو جھیلو' جھیلو' جھیلو!

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

زبیدہ سلطانہ

جہلم کے علاقے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سچی کہانی ہے۔

بخشو بے چارا ایک ادھیڑ عمر محنت کش تھا۔ دن رات محنت مزدوری کرتا۔ دن بھر مشقت کے بعد اگر رات کو بھی کوئی کام مل جاتا تو فوراً مستعدی کے ساتھ دوڑ پڑتا۔ جو کچھ کماتا گھر والی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ وہ پھر بھی ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی اور گھر کی ضرورتوں کے لیے تقاضا کرتی رہتی۔ گھر میں قدم رکھنے سے لے کر صبح دہلیز سے واپس نکلنے تک غریب بخشو کی جان بخشی نہ ہوتی۔

اب ان دنوں بیٹی کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ بخشو تھکا ہارا آکر بیٹھا ہی تھا کہ بیوی نے چھوٹتے ہی کہا۔ "ہاں تو پھر کچھ فکر کیا تم نے لڑکی کے گہنوں کا؟"

بخشو چپ رہا تو وہ بولی "اب کچھ بولو گے بھی کہ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے رہو گے؟ بات کرو تو چپ سادھ چھوڑتے ہو کہ "بس اک چپ سو سکھ!!"

"نیک بخت! آکر دم تو لینے دیا کرے۔ میں آخر کہوں تو کیا کہوں جو کچھ کماتا ہوں لاکر تیرے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ تجھ سے چھپا کر الگ تو کچھ نہیں رکھ لیتا۔ اب اس میں تو سیاہ کر سفید کر تیری اپنی مرضی" بخشو نے جواب دیا۔

"نا بھلا بتا تو سہی! اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟ کہ میں لڑکی کا گہنا پاتا بھی اسی روز کے خرچ میں سے بناؤں؟" وہ چیخ کر بولی۔

"یہ میں نے کب کہا ہے؟ تو گھبرایا نہ کر، اللہ پر بھروسا رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

بات ٹالنے کو بخشو نے اس وقت دھیما ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی مگر اس کی بیوی راجو کب ٹلنے والی تھی۔

"اللہ بھی محنت کرنے والوں کو ہی دیتا ہے۔ چھپر پھاڑ کر کسی کو نہیں دیتا۔ بڑا آیا ہے اللہ پر بھروسا کرنے والا"۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"چھپر پھاڑ کر بھی دیتا ہے۔ تو اس کی ذات پر بھروسا کر کے تو دیکھ!" بخشو نے پوری عقیدت سے کہا۔

"اونہہ! آیا بڑا ولی اللہ!" وہ ہاتھوں سے ایکشن کرتے ہوئے بولی۔

اتنے ہی میں محلے کی کوئی عورت آگئی اور راجو اسے دیکھ کر چپ ہو گئی۔ بخشو نے خدا کا شکر کیا۔ اس کی بیٹی جنت دوسرے کمرے سے آکر اس کے آگے روٹی رکھتے ہوئے بولی۔

"لو بابا تم کھانا کھاؤ، اماں تو بس یونہی......" اس کو ماں کا یہ رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ بخشو نے خوش ہو کر بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور "میری بیٹی! اللہ سب بہتر کرے گا"۔ کہہ کر کھانا کھانے لگا۔ اتنے میں جنت نے حقہ تازہ کر کے اور چلم بھر کر اس کے قریب رکھ دیا۔ راجو کہیں ہمسائی کے ساتھ محلے میں چلی گئی تھی۔ بخشو نے سکھ کا سانس لیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

اگلے دن صبح جب بخشو روٹی اور لسی کا ناشتا کر کے کام پر جانے لگا تو راجو نے پکارا...... "میں نے جو کہا ہے اس کا فکر رکھنا؟"

جنت نے باپ کو دوپہر کے کھانے کی پوٹلی پکڑائی اور وہ بیوی کے تقاضے کے بوجھ تلے سر جھکائے گھر سے نکل گیا......

صبح بیوی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ کسی ساتھی یا کسی یار بیلی سے ادھار لے کر بیٹی کا زیور ضرور خرید لے جس کی اگلے مہینے شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔

بخشو کو بھی آنے والے خرچ کا فکر تھا مگر وہ کیا کرتا۔ جہاں تک اس کا بس چلتا وہ محنت کر رہا تھا۔ ان دنوں جہلم کے دریا پر پل بن رہا تھا۔ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ برطانیہ ہی کی کسی مشہور کمپنی نے پل تعمیر کرنے کا کام سنبھال رکھا تھا۔ قریب کی آبادیوں کے رہنے والے مزدوری پر لگے ہوئے تھے

جن میں ایک بخشو بھی تھا۔ ہفتے کے بعد سب کو مزدوری کی اچھی خاصی رقم ادا کی جاتی تھی۔ جب سے بخشو نے اس کمپنی میں کام کرنا شروع کیا تھا اس کے گھر کے حالات کافی سدھر گئے تھے مگر اس کی بیوی راجو قناعت جیسے وصف سے محروم تھی اور اپنے وسائل کے اندر رہ کر گزر بسر کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

اس روز کام کرتے ہوئے بخشو کے ذہن پر سارا وقت یہی فکر سوار رہا کہ بیوی کے اس مطالبے کو کیسے پورا کرے؟ کس سے قرض مانگے؟ سب ہی اسی کی طرح کے مزدور تھے اور اسی مزدوری پر ان کا بھی دار و مدار تھا۔ اس کے ہاتھ کام میں لگے تھے مگر دل اور دماغ کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ رہ رہ کر راجو کے چنگھاڑتے ہوئے طعنوں کے تیر اس کی سماعت میں گونج جاتے تھے۔ ایک پھیرے میں وہ سیمنٹ کا تانبیا اٹھا کر چلنے ہی لگا تھا کہ اسے زبردست پھریری آئی اور اس کا دل ڈوب گیا اور وہ سینہ تھام کر وہیں ایک اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

انگریز اگر مزدوری اچھی دیتے تھے تو اس کے بدلے کام بھی اتنی سختی سے لیتے تھے کہ مزدور کا خون پسینہ ایک ہو جائے۔ کمپنی کے سپروائزر نے جو دور سے دیکھا کہ کوئی مزدور کام کے وقت میں ایک جگہ بیٹھا ہوا ستا رہا ہے تو دوڑا ہوا اس کے سر پر آن پہنچا اور ڈپٹ کر بولا۔ "ویل مین! کیا ہوا؟"

بخشو نے اپنی دیہاتی بولی میں جواب دیا "صاحب! کوٹھی تھاں نہیں رہی!"

صاحب کے کچھ پلے نہ پڑا۔ قریب کھڑے اپنے دیسی اسٹنٹ سے پوچھنے لگا۔ "ویل؟ کیا بولتا؟"

اسٹنٹ نے بخشو کی بات کی تشریح کرتے ہوئے صاحب کو بتایا۔ "صاحب یہ کہتا ہے کہ کوٹھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہی ہے"

یہ سنتے ہی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "کیا ہوا کوٹھی کو؟ جلدی سے انجنیئر کو خبر کرو، کوٹھی جگہ پر نہیں ہے' اب کیا ہوگا؟ کون سی کوٹھی؟ جلدی دیکھو"۔

اس علاقے میں کام کرنے والے انگریز بھی مقامی لوگوں کی بولی سے کچھ نا کچھ واقفیت پیدا کر لیتے تھے۔ اب "کوٹھی" وہ لوگ پل کے نیچے بنائے جانے والے ان میناروں کو کہتے تھے جن کے اوپر پل بچھایا جاتا ہے۔

بخشو کی اس بات پر آن کی آن میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ سارے انجینئر اکٹھے ہو گئے۔ ایک ایک کر کے ہر ایک کوٹھی یعنی پل کے سہارے کے لیے بنائے جانے والے ہر مینار کا جائزہ لیا جانے لگا۔ پیمائش کی جانے لگی۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک کوٹھی سچ مچ ایک طرف سے دریا کی ریت میں دھنس رہی تھی۔ سب نے قیاس کر لیا کہ بخشو نے اسی کوٹھی کی نشان دہی کی ہے۔ حال آں کہ بخشو نے تو بتایا تھا کہ اس کا دل ٹھکانے نہیں رہا۔ اس نے یہ کہنا چاہا کہ دل بیٹھ رہا ہے۔ اس علاقہ کے دیہاتی لوگ دل کو بھی کوٹھی کہہ لیتے ہیں۔

مگر اس موقع پر بخشو کے دل کا ٹھکانے پر نہ رہنا یا پھر خود اس کے لفظوں میں کوٹھی کا تھاں نہ رہنا اس کا مقدر سنوار گیا۔ ادھر اتفاق ایسا ہوا کہ واقعی پل کی کوٹھی دھنستی ہوئی پائی گئی۔ اس نشان دہی پر بخشو کو بہت بھاری رقم انعام میں ملی۔ کمپنی کی سفارش پر حکومت نے بھی بہت سی زمین اسے بخشیش میں دی۔ انگریز جب ہند و پاک کی سرزمین پر حکم ران تھے تو ہر اس شخص کو جو ان کے حسب منشا خدمات بجالاتا' جاگیر کے طور پر زمین عطا کرنے میں بڑے دریا دل تھے! کیوں کہ اس عطیے میں ان کی نہ تو ہینگ لگتی نہ پھٹکری اور بخشیش پانے والے جاگیر دار پر زمین داری اور جاگیر دار کا رنگ بھی چوکھا چڑھ جاتا اور وہ اپنی اوقات بھول کر فرعون بن بیٹھتا۔ ہاں مگر بات ہو رہی تھی بخشو کے انعام کی...... کافی رقم اور زمین پا کر بخشو بھی اب چودھری خدا بخش بن گیا۔ اللہ نے اس کے بھروسے اور پکے یقین کی لاج رکھ لی اور اسے چھپر پھاڑ کر دولت بخش دی۔ اس نے چاندی کے بجائے بیٹی کو سونے کا زیور پہنا کر عزت سے رخصت کیا۔ یعنی اللہ نے اسے سچ مچ چھپر پھاڑ کر دیا۔ اس کی شان کریمی سے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ بندے کو بھی لازم ہے کہ اس کی عطا پر ہمیشہ شکر گزار رہے اور کشائش حاصل ہونے پر سرکش نہ بنے۔

* * *

آئیے مسکرائیں

تیسری بار ایل بی ڈبلیو کی اپیل بھی منظور نہ ہوئی تو باؤلر کو تاؤ آگیا۔ وہ امپائر کی طرف پلٹا اور غصے سے بولا۔ "جناب عالی! یہ بتائیں آپ کی چھڑی کہاں ہے؟"

"چھڑی؟ کیسی چھڑی؟ میرے پاس تو کوئی چھڑی نہیں ہوتی ہے" امپائر نے حیرت سے کہا۔

"کمال ہے" باؤلر غرایا "میں نے آج تک کسی نابینا کو بغیر چھڑی کے نہیں دیکھا" (عبدالمالک شاہدرہ)

دکان کا مالک (نئے ملازم سے): تمہیں منشی نے کام سمجھادیا ہے نا۔

نیاملازم "جی ہاں، انہوں نے کہا ہے کہ جب آپ کو آتا دیکھوں فوراً انہیں جگادوں (ارسلان الٰہی شاہدرہ)

گاہک: "ویٹر، میں نے تم سے آلو کا پراٹھا مانگا تھا لیکن اس میں تو آلو نہیں"

ویٹر: "نام میں کیا رکھا ہے جناب، اگر کشمیری پلاؤ مانگتے تو کیا آپ کو اس میں کشمیر مل جاتا" (محمود الحسن لاہور)

ایک ٹی وی کی اناؤنسر کے گھر پارٹی ہوئی۔ جب کھانا لگ گیا تو موصوف مہمانوں میں پہنچیں اور جھک کر بولیں "یہ کھانا آپ کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کے تعاون سے پیش کیا جارہا ہے"

(اسماعرفان راول پنڈی)

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "کیوں بھئی تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟"

"اپنے گلے کی وجہ سے" دوست نے آہ بھر کر کہا۔

"تمہارے گلے کو کیا ہو گیا؟" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی"

(عفیفہ بدرالنسا راول پنڈی)

باپ (بیٹے سے): "میں آج بھی اتنا طاقتور ہوں جتنا جوانی میں تھا"

بیٹا: وہ کیسے؟

باپ: "وہ سامنے جو پتھر پڑا ہے وہ مجھ سے جوانی میں بھی نہیں ہلتا تھا اور آج بھی نہیں ہلتا

(ثناءاللہ فاروق بہاول پور)

عید سے اگلے دن دو دوست ملے۔ پہلا دوست: "ہاں بھئی! روزے رکھے رمضان کے"

دوسرا دوست: "نہیں یار، میں بیمار ہو گیا تھا، ڈاکٹر نے روزے رکھنے سے منع کیا تھا"۔

پہلا دوست: "چلو عید کی نماز تو کل پڑھی ہو گی"۔

دوسرا دوست: "نہیں یار، ٹانگ میں درد تھا نماز کیسے پڑھتا"۔

پہلا دوست: "عید کی سویاں تو کھائی ہی ہوں گی؟"

دوسرا دوست: تو کیا تم نے مجھے بالکل کافر سمجھ رکھا ہے کہ عید کی سویاں بھی نہ کھاتا (طارق محمود مریدکے)

مالک مکان (چور کو پکڑ کر): بہتری اسی میں ہے کہ تم سارا سامان یہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔

چور: جناب، یہ کیسے ہو سکتا ہے، آدھا سامان تو آپ کے ہمسایوں کا ہے (سلمیٰ جبین شکردرہ)

سائنس فکشن

حسن ذکی

پھول بستی

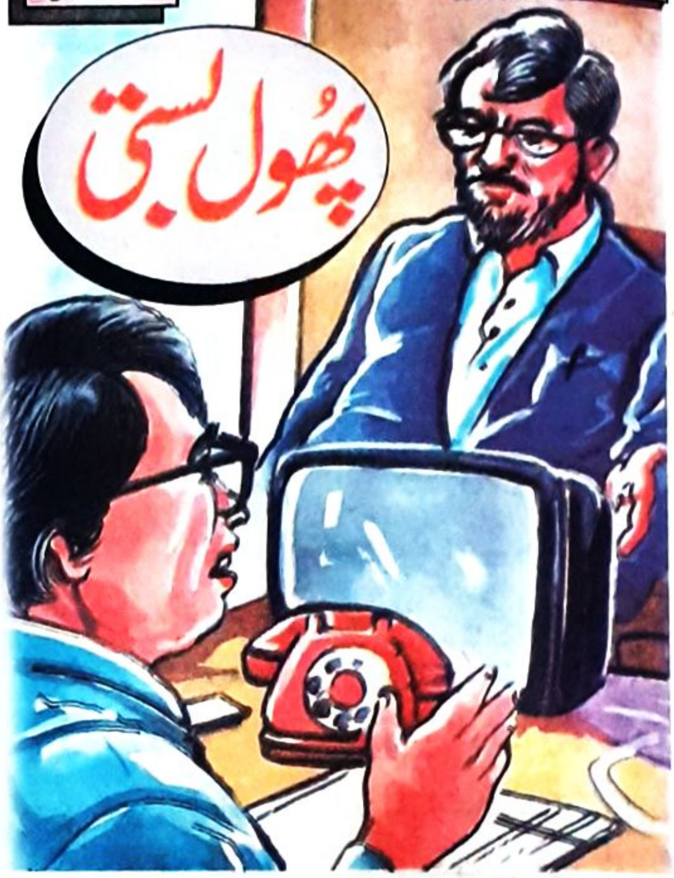

ڈاکٹر ابراہیم ایک عظیم سائنس دان تھے۔ سائنس کے میدان میں ان کے کارناموں کو دنیا مانتی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس بستی کے لوگوں پر انہوں نے اتنا بڑا احسان کیا تھا جس کا بدلہ یہ لوگ قیامت تک نہ چکا سکتے تھے۔

یہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ڈاکٹر ابراہیم نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا۔ کمپیوٹر بند کیا، ضروری کاغذ میز کی دراز میں رکھ کر تالا لگایا اور قمیص کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے اپنے ڈائرکٹر ڈاکٹر احمد فواد کے کمرے کی طرف لپکے۔ کمرے کے دروازہ پر دستک دی تو ڈاکٹر فواد کی آواز آئی۔ "اندر آجائیے"۔

ڈاکٹر ابراہیم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں گھر نہ چلے گئے ہوں"۔

ڈاکٹر فواد مسکراتے ہوئے بولے "گھر کیسے جا سکتا ہوں میرے بھائی، ابھی تو کئی ضروری کام باقی ہیں"۔

ڈاکٹر ابراہیم اپنی جگہ رکتے ہوئے بولے "اگر آپ مصروف ہیں تو میں بعد میں آجاؤں گا"۔

ڈاکٹر فواد نے جلدی سے کہا۔ "ارے نہیں، تم بیٹھو تم سے بات بھی ہوتی رہے گی اور کام بھی۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

ڈاکٹر ابراہیم سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے بولے۔ "دراصل کچھ دن بعد مجھے دو تین مہینے کی چھٹی چاہیے"۔

ڈاکٹر فواد نے پریشانی کے انداز میں کہا "کیوں خیریت تو ہے؟ یہ اس عمر میں سیر سپاٹے کا شوق ہو گیا ہے کیا؟"

ڈاکٹر ابراہیم ہنسے اور بریف کیس میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولے۔ "نہیں ڈاکٹر فواد، سیریں تو بہت کرلیں۔ اب تو ایک ضروری کام کے سلسلے میں چھٹی لے رہا ہوں۔ چلئے آپ کو بتا ہی دوں۔ یہ ایک خاص پروجیکٹ ہے۔ میں کچھ دن کے لیے احمقوں کی بستی میں رہنا چاہتا ہوں تاکہ کچھ تحقیقی کام کر سکوں"۔

"ہائیں! احمقوں کی بستی؟ وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟"

ڈاکٹر فواد نے حیران ہوتے ہوئے کہا اور پھر چند لمحے بعد خود ہی بول پڑے۔ "اچھا اچھا اب سمجھا۔ تو بھئی یہ تمہیں کیا سوجھی؟ مجھے ڈر ہے کہ تم کئی مہینے احمقوں کی بستی میں رہے تو کہیں ہمیں تم سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑجائیں۔ تم نے وہ فارسی کا مقولہ سنا ہے "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد"، یعنی جو بھی نمک کی کان میں گیا نمک ہو گیا۔ تو بھائی میں یہ نہیں چاہتا کہ تم احمقوں کی بستی میں رہ کر خود بھی......"

ڈاکٹر فواد بات کرتے کرتے رک گئے تو ڈاکٹر ابراہیم بولے "چلئے کیا فرق پڑتا ہے، مجھے احمق بننا منظور ہے لیکن یہ پتا ضرور لگاؤں گا کہ اس بستی کی شہرت کی وجہ کیا ہے؟"

ڈاکٹر فواد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم اس بات کی تحقیق سائنسی بنیاد پر کرنا چاہتے ہو کہ لوگ اس بستی کو احمقوں کی بستی کیوں کہنے لگے۔ لیکن اگر تم واقعی سائنسی بنیاد پر یہ تحقیق کرنا چاہتے ہو تو پھر چھٹی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا ادارہ تو خود یہ چاہے گا کہ تم یہ تحقیق ذاتی طور پر کرنے کے بجائے ادارہ کی طرف سے کرو۔ تم جب تک یہ تحقیق کرو گے یہی سمجھا

جائے گا کہ تم ہمارے سائنسی ادارے کا کام کر رہے ہو اور اس تحقیق کا سارا خرچ بھی ادارہ دے گا۔ کہو منظور ہے؟"

ڈاکٹر ابراہیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا "اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں تو بڑی اچھی بات ہے"۔

تھوڑی دیر تک ڈاکٹر فواد اور ڈاکٹر ابراہیم اس نئے منصوبے کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر ڈاکٹر ابراہیم اٹھ کر گھر چلے گئے۔

احمقوں کی بستی کا اصل نام تو بڑا اچھا تھا۔ "پھول بستی" لیکن بہت دن سے لوگوں نے اسے احمقوں کی بستی کہنا شروع کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ اس کا اصلی نام بھول ہی گئے تھے۔ یہ بستی تھی تو مشہور لیکن اس کی شہرت ایسی تھی کہ جو کوئی اس کا نام سنتا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور آ جاتی۔ پورے ملک میں مشہور تھا کہ اس بستی میں صرف بے وقوف رہتے ہیں۔ جو بھی بچہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ اپنی عقل اللہ میاں کے ہاں چھوڑ آتا ہے۔ لوگوں نے بستی کے باشندوں کے بارے میں جھوٹے سچے کئی لطیفے بھی مشہور کر رکھے تھے۔

پتا نہیں ان میں کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ لیکن یہ سب جانتے تھے کہ اس بستی کے لوگ نہ پڑھتے لکھتے تھے اور نہ ہی انہوں نے زندگی میں کوئی ترقی کی تھی۔ یہ بات بھی مشہور تھی کہ پھول بستی پر آسیب کا سایہ ہے اور اس آسیب کی وجہ سے یہاں کے لوگ نہ پڑھ لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی زندگی میں ترقی کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں تھیں جن کی تحقیق کے لیے ڈاکٹر یحییٰ ابراہیم پھول بستی پہنچے اور سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے۔ اس کام کے لیے ادارہ کی طرف سے انہیں بہت کم وقت دیا گیا تھا کیوں کہ وہ اپنے دفتر اور تجربہ گاہ میں ایک بہت اہم اور مشکل تحقیقی کام کر رہے تھے جسے زیادہ دن کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

پھول بستی میں ڈاکٹر ابراہیم بہت سے لوگوں سے ملے۔ ان سے باتیں کیں، معلومات حاصل کیں اور سرکاری ریکارڈ پڑھا۔ ادارے میں واپس آ کر انہوں نے جو رپورٹ تیار کی اس کا خلاصہ یہ تھا:

نہ تو پھول بستی پر کسی آسیب کا سایہ ہے اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ بے وقوفی اس بستی کے لوگوں کو ورثہ میں ملتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے یہ علاقہ ایک جاگیر دار کے پاس تھا جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بستی اور آس پاس کے لوگ تعلیم حاصل کریں یا ترقی کریں کیوں کہ اس طرح اس کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا اور وہ لوگوں پر حکومت نہ کر سکتا۔ اپنی من مانی کرنے اور حکومت قائم رکھنے کے لیے اس نے مشہور کر دیا کہ یہ لوگ نہایت بے وقوف ہیں اور اس لائق ہی نہیں کہ پڑھ لکھ سکیں یا ترقی کر سکیں۔ جاگیر دار نے بستی کے لوگوں کی جہالت اور بے وقوفی کے بہت سے قصے بھی مشہور کرا دیے۔

جاگیر دار کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ پھول بستی کے لوگ رفتہ رفتہ خود بھی یہ یقین کر بیٹھے کہ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے اور وہ واقعی کم عقل ہیں۔ اب جاگیر داری تو ختم ہو گئی اور وہ ظالم جاگیر دار بھی مر گیا لیکن یہ لوگ اپنی حالت ٹھیک کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے اور بالکل ہمت ہارے ہوئے ہیں۔

رپورٹ کے آخر میں ڈاکٹر ابراہیم نے لکھا کہ شاید کوئی سائنسی معجزہ ہی پھول بستی کے باشندوں کو اس چکر سے نکال سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم نے یہ رپورٹ اپنے ڈائرکٹر ڈاکٹر احمد فواد کو دے دی اور خود اس تحقیقی کام میں لگ گئے جسے وہ ادھورا چھوڑ کر پھول بستی چلے گئے تھے۔ وہ اپنے کام میں بہت زیادہ مصروف تھے اور انہیں بالکل فرصت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود نہ وہ پھول بستی کے لوگوں کو بھولے تھے اور نہ بستی کے لوگ انہیں بھولے۔ ڈاکٹر ابراہیم جتنے دن پھول بستی میں رہے بہت خوش رہے۔ اس بستی کے لوگ بڑے سادہ اور نیک تھے اور مہمانوں کی بہت خاطر کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر ابراہیم کی بھی بہت خاطر کی۔ اسی لیے ان لوگوں سے ڈاکٹر ابراہیم کی دوستی ہو گئی۔ دوستی تو ان کی سب سے تھی لیکن ادریس سے زیادہ دوستی ہو گئی تھی۔ پھول بستی میں ادریس کی ایک بہت بڑی دکان تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں اور گھر کی ضرورت کا سامان بکتا تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم جب پھول بستی میں تھے تو ادریس کے ہاں ایک بیٹا

پیدا ہوا جس کا نام اس نے حسن رکھا۔

حسن بہت خوب صورت اور صحت مند تھا۔ ادریس اور اس کی بیوی بیٹے کے پیدا ہونے سے بہت خوش تھے۔ لیکن ادریس یہی سوچا کرتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کی طرح کم عقل ہو گا اور پڑھ لکھ نہیں سکے گا۔ ڈاکٹر ابراہیم ادریس کو بہت سمجھاتے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بستی کے لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے بارے میں یقین کر لیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔ جب انسان ہمت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ ادریس کو ڈاکٹر ابراہیم کی باتیں بہت اچھی لگتیں لیکن اسے یقین نہ آتا تھا کہ پھول بستی کے لوگ بھی ترقی کر سکیں گے۔

بعد میں ڈاکٹر ابراہیم دوبارہ تھوڑی دیر کے لیے پھول بستی گئے اور ایک دن صبح صبح ادریس اپنی بیوی اور حسن کو ساتھ لیے ڈاکٹر ابراہیم کے گھر پہنچا اور ان کا مہمان بن گیا۔ ڈاکٹر ابراہیم اور ان کے بیوی بچوں کو حسن کے آنے کی خاص طور سے خوشی ہوئی کیوں کہ گھر میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا۔

حسن سب کے لیے ایک کھلونا بن گیا۔ ڈاکٹر ابراہیم کبھی کبھی ادریس اور حسن کو اپنے ساتھ اپنی تجربہ گاہ میں بھی لے جاتے۔ وہ اپنا کام بھی کرتے رہتے اور باتیں بھی کرتے رہتے۔ ادریس کی بیوی گھر کے کاموں میں ڈاکٹر ابراہیم کی بیوی کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ عمر میں ڈاکٹر ابراہیم کی بیوی سے کافی کم تھی لیکن دونوں میں خوب دوستی ہو گئی تھی۔ ادریس اور اس کی بیوی بیٹا کئی مہینے ڈاکٹر ابراہیم کے مہمان رہے اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔

چار سال گزر گئے۔ اللہ نے ادریس کو ایک بیٹی بھی دی اور پھر ایک دن ادریس حسن کو ساتھ لیے پھول بستی سے ڈاکٹر ابراہیم کے گھر آیا۔ چند دن کے بعد حسن کا داخلہ شہر کے ایک بہت اچھے اسکول میں ہو گیا۔ پھول بستی میں تو جاگیر دار نے کوئی اسکول کھلنے ہی نہیں دیا تھا اس لیے ڈاکٹر ابراہیم کے کہنے اور سمجھانے سے ادریس اس بات پر تیار ہو گیا تھا کہ اس شہر میں حسن کا داخلہ کرا دے۔ یہ بہت بڑا اور مشہور اسکول تھا جس میں داخلے کے لیے سخت مقابلہ ہوتا تھا۔ ادریس بہت حیران بھی ہوا اور خوش بھی جب اسے معلوم ہوا کہ داخلہ ملنے والے بچوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام حسن کا تھا۔

یہ تو پہلا قدم تھا لیکن پھر تعلیم کے میدان میں حسن کے ہر قدم نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ خود حسن کے استاد بھی اس کی ذہانت پر حیران رہ گئے کیوں کہ یہ غیر معمولی ذہانت تھی جو بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی ذہانت کی خبریں پھول بستی میں پہنچیں تو رفتہ رفتہ دوسرے لوگوں کی بھی ہمت بندھنے لگی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر ابراہیم کی کوششوں سے بستی میں اسکول بھی کھل گیا۔ یہ بڑا اچھا اسکول تھا جس میں بچوں کی تعداد دھیرے دھیرے بڑھنے لگی اور کچھ دن بعد پھول بستی کے کئی بچے شہر کے اسکولوں میں بھی پڑھنے لگے۔

اب پھول بستی کے باشندوں کی سوچ اور ان کے طور طریقے بدل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آسیب ٹوٹ رہا ہو جو اس بستی پر بہت برسوں سے سایہ کیے ہوئے تھا، جہالت کا آسیب۔ ادھر ڈاکٹر ابراہیم اور ڈاکٹر فواد بہت خوش تھے کہ وہ

سائنسی معجزہ رونما ہو گیا ہے جس کا ڈاکٹر ابراہیم نے پھول بستی کے بارے میں اپنی رپورٹ میں ذکر کیا تھا۔ یہ سائنسی معجزہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں ابھی تک کوئی نہ جانتا تھا سوائے ڈاکٹر ابراہیم اور ڈاکٹر فواد کے یا پھر اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ادریس اور اس کی بیوی کو تھیں کیوں کہ ان کی مرضی کے بغیر یہ معجزہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

جن دنوں ڈاکٹر ابراہیم کے گھر ادریس اور اس کی بیوی بیٹا آکر رہے تھے ان دنوں وہ اپنے ادارہ میں ایک بہت اہم اور مشکل کام کر رہا تھا اور اپنے تجربہ کے لیے انہیں ایک ایسے بچہ کی ضرورت تھی جس کی عمر بہت کم ہو۔ ڈاکٹر ابراہیم نے ادریس اور اس کی بیوی سے بات کی اور وہ دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ ڈاکٹر ابراہیم ان کے بیٹے حسن پر تجربہ کرلیں۔ انہیں ڈاکٹر ابراہیم کی اس بات پر یقین تھا کہ حسن کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اس تجربہ سے نہ صرف ان کے بچے کو بلکہ پوری بستی کے بچوں کو فائدہ پہنچے گا۔

یہ تجربہ دراصل بیسویں صدی کے آخر میں امریکی سائنس دانوں نے شروع کیا تھا۔ انہوں نے دو سو ذہین بچوں کے دماغی خلئے حاصل کر کے ان کا مقابلہ دو سو ایسے بچوں کے دماغی خلیوں سے کیا جن کی ذہانت اوسط درجہ کی تھی یا کم تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ذہین بچوں کے خلیوں میں بعض ایسے جین یا مورثے پائے گئے جو کم ذہانت والے بچوں کے دماغی خلیوں میں نہیں تھے۔ ان سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ بہت جلد ان مورثوں کو اچھی طرح پہچان لیا جائے گا جو انسان کو ذہین بناتے ہیں۔ پھر ایسے طریقے ایجاد ہوں گے جن سے نئے بچے کے دماغ کا معائنہ کر کے یہ پتا لگایا جا سکے گا کہ وہ زیادہ ذہین ہے یا اوسط درجہ کا یا کم ذہین۔ اس کے بعد سائنس دانوں کا اگلا قدم یہ ہو گا کہ وہ ذہانت والے خلیوں یا مورثوں کو اپنی تجربہ گاہ میں بہتر بنا کر اور ان کی تعداد بڑھا کر انہیں اوسط ذہانت یا کم ذہانت والے بچوں کے دماغ میں داخل کریں گے تاکہ یہ بچے غیر معمولی ذہین بن جائیں۔

یہ 2005ء کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم کو یہ خبر ملی تو انہوں نے فوراً امریکی سائنس دانوں سے رابطہ کیا۔ وہ کئی بار امریکا جا

کر ان سائنس دانوں سے ملتے بھی رہے اور پانچ سال تک دن رات محنت کر کے آخر انہوں نے ذہانت کے خلیوں کو پہچان لیا اور پھر حسن کے دماغ میں ان خلیوں کی تعداد بڑھا کر اپنا پہلا تجربہ کیا۔ دنیا میں وہ پہلے سائنس دان تھے جنہوں نے اس تجربہ میں کامیابی حاصل کی اور حسن کو ایک اوسط درجے کے ذہین بچے سے ایک غیر معمولی اور بے حد ذہین بچہ بنا دیا۔

یہی وہ سائنسی کارنامہ تھا جس نے احمقوں کی بستی کو دوبارہ پھول بستی بنا دیا اور وہ ذہنی آسیب ختم کر دیا جو وہاں کے باشندوں کو تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کرنے سے روکے ہوئے تھا۔ حسن کی غیر معمولی ذہانت کا راز تو بستی والے نہیں سمجھ سکے لیکن اس کی تعلیم اور ترقی نے ان میں ہمت پیدا کر دی اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔

2025ء کو ڈاکٹر ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں پھول بستی میں دفن کیا گیا۔ پھول بستی والوں کے لیے بھی یہ بڑی عزت کی بات تھی کہ اس عظیم انسان کی قبر ان کی بستی میں بنے جس نے ان پر اتنا بڑا احسان کیا تھا۔

ورلڈ وائلڈ لائف

ڈاکٹر رضوان ثاقب

وہیل اور ڈولفن

اگرچہ وہیل اور ڈولفن اپنی شکل وصورت اور عادات کے لحاظ سے مچھلیوں سے مشابہ ہیں لیکن یہ دراصل ممالیہ جانور ہیں اور اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ مچھلی کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں۔ یہ جانور ساری زندگی پانی میں گزارتے ہیں وہیں ان کی نسل آگے بڑھتی ہے۔

وہیل کا جسم مچھلی نما ہوتا ہے۔ اس کا سر بڑا لیکن گردن باقی دھڑ سے الگ نہیں نظر آتی۔ نتھنے سر کے اوپر ہوتے ہیں اور ان میں بیرونی کان بھی موجود نہیں ہوتے۔ اگلے بازو چپوؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ پچھلے پاؤں ناپید ہوتے ہیں۔ دم تیرنے میں سب سے زیادہ مددگار ہوتی ہے۔ بال بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کے نچلے جبڑے میں دانت کی جگہ ایک تالو سے لگی ہوئی پلیٹ ہوتی ہے جسے بالین کہتے ہیں۔ یہ بالین ہڈی پانی میں سے وہیل کی خوراک کو چھلنی کر کے نکالتی ہے۔

پاکستان میں پائی جانے والی وہیلوں میں عام رار قویل وہیل کا شمار بڑی وہیلوں میں ہوتا ہے۔ مادہ رار قویل اپنے نر سے بڑی یعنی 20 میٹر کے لگ بھگ لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کا وزن 45000 کلوگرام تک ہو جاتا ہے۔ پشت اور پہلوؤں کا رنگ نیلگوں سیاہ جب کہ بطن سفید ہوتا ہے۔ اس کے جسم میں نیل کی مقدار بہت ہوتی ہے جس کی خاطر اسے بہت شکار کیا گیا ہے۔ سمندر میں ضرورت کے تحت 48 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کر سکتی ہے۔

دوسری قسم بڑی نیلی وہیل کی ہے جس کی لمبائی میں 33 میٹر تک ہو جاتی ہے اور اس کا وزن 130000 کلوگرام تک ہو جاتا ہے۔ آج تک دنیا میں جتنے بھی حیوان پیدا ہوئے ہیں بڑی نیلی وھیل ان میں سب سے بڑا حیوان ہے۔ ان کے جسم کا رنگ مختلف حصوں میں نیلا، سیاہ وغیرہ ہوتا ہے۔ یہ گرم سمندروں میں داخل نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی بھٹک کر ساحل مکران پر آجاتی ہے۔ بڑی قد و قامت کے باوجود 26.5 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے تیر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ تیسری قسم کی وہیل کُڑی پشت وہیل کہلاتی ہے۔ یہ چھوٹی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی پاکستانی سمندر میں نظر آجاتی ہے۔ ان کی خوراک سمندری جھینگے دوسرے قشرے اور گھونگے وغیرہ ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 16 میٹر ہوتی ہے اور یہ گہرے پانیوں میں رہتی ہے۔

ان وہیلوں کے علاوہ بھی کچھ اور قسموں کی وہیلیں پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ ان وہیلوں اور ڈولفنوں میں نچلے جبڑے پر یکساں شکل کے بہت سے دانت ہوتے ہیں۔ انہیں دانت بردار وہیل کہتے ہیں۔ ان میں نر مادہ سے بڑا ہوتا ہے۔ اور ان میں دونوں نتھنے مل کر ایک مشترک سوراخ میں کھلتے ہیں۔ ان کی لمبائی ایک میٹر سے 18 میٹر تک ہوتی ہے۔ عام طور پر کم لمبائی والی دانت بردار وہیلوں کو ڈولفن کہتے ہیں جب کہ بڑے قامت والی وہیل کہلاتی ہیں۔ پاکستان میں ڈولفنوں اور دانت بردار وہیلوں کی مندرجہ ذیل اقسام ملتی ہیں: ٹھگنی سپرم وہیل، چھوٹا ہندوستانی پورپائز، سندھ ڈولفن، راس ڈولفن، پلمبیس ڈولفن، بحیرہ قلزم بوتل ناک ڈولفن، ہندوستانی چوڑی چونچ ڈولفن۔

ٹھگنی سپرم وہیل شاذ و نادر ہی 305 میٹر سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ پشت اور پہلوؤں پر نیلگوں سیاہ ہوتا ہے۔ سر آگے سے چپٹا ہوتا ہے۔ یہ بہت گہرا غوطہ لگاتی ہے۔

چھوٹا ہندوستانی پورپائیز بھی وہیل کا سر موٹا، چوڑا اور بغیر تھوتھنی کے ہوتا ہے۔ کل لمبائی ایک اعشاریہ پانچ میٹر تک ہوتی ہے۔ اس کا رنگ عنابی سیاہ ہوتا ہے۔ چھوٹے جھینگے، سیپیاں، گھونگے اور چھوٹی مچھلیاں اس کی خوراک ہیں۔ ڈولفنون میں راس ڈولفن بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی ایک اعشاریہ پانچ سے دو اعشاریہ چھ میٹر تک ہوتی ہے اور ساحلی پانیوں میں ملتی ہے۔ اس کے جسم کا رنگ سلیٹی مائل سیاہ ہوتا ہے۔

پلمبیس ڈولفن سندھ ڈولفن سے ملتی جلتی لیکن اس سے دبلی اور زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ عنابی سلیٹی یا گلابی سلیٹی ہوتا ہے۔ یہ مکران کے ساحل پر ملتی ہے اور مچھلیوں وغیرہ کو کھاتی ہے۔

بحیرہ قلزم بوتل ناک ڈولفن امریکا کے مشرقی ساحلی پانیوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ پالتو حالت میں اسے کھارے پانی والے تالابوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس کا رنگ گہرا سلیٹی یا سنہری مائل سلیٹی ہوتا ہے۔ ہندوستانی چوڑی چونچ ڈولفن کا رنگ سیاہ سلیٹی ہوتا ہے۔ بالغ کی لمبائی دو اعشاریہ پانچ میٹر ہوتی ہے۔ اس میں واضح تھوتھنی نہیں ہوتی۔

سندھ ڈولفن دریائے سندھ میں ملتی ہے۔ یہ ایک عام ڈولفن کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا دم کے قریب والا حصہ پہلوؤں سے دبا ہوا اور دبلا ہوتا ہے۔ اس کی دم کھرپے کی طرح چوڑی اور چپوؤں کی طرح کام کرتی ہے۔ پیشانی اٹھی ہوئی اور تھوتھنی دبلی اور لمبی ہوتی ہے۔ بالغوں کے دانت 34 ہوتے ہیں۔ نروں کی تھوتھنی مادہ کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ سندھ ڈولفن کا رنگ گلابی سلیٹی بھورا یا عنابی سلیٹی بھورا ہوتا ہے۔ جلد چھونے میں ریشم کی طرح نرم ہوتی ہے جو با آسانی سے کٹ جاتی ہے۔ بالغ نر ڈولفن کی لمبائی 1.23 سے 1.37 میٹر تک دیکھی گئی ہے۔ مادہ 2.3 سے 2.6 میٹر تک لمبی ہوتی ہے۔ سندھ ڈولفن دریائے سندھ کے گدلے اور مٹی ملے پانیوں میں رہتی ہے۔ معاشرتی طور پر گروہوں میں رہنے کے باعث 10 ڈولفن تک اکٹھی دائرے بناتی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سانس لینے کے لیے سطح پر ابھرتی ہیں لیکن سات آٹھ منٹ کا لمبا غوطہ بھی لگا لیتی ہیں۔ ان کی خوراک دریائے سندھ میں ملنے والی مچھلیاں اور جھینگے ہیں جنہیں یہ اپنی آواز کی بازگشت (Echolocation) کے ذریعے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ یہ طریقہ وہ اس لیے اپناتی ہیں کہ سندھ کا پانی گدلا ہوتا ہے جس میں نظر کام نہیں کرتی۔ ویسے بھی ان کی آنکھیں ناکارہ ہوتی ہیں یعنی ان میں عدسہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ 1 سے 90 لہریں فی سکنڈ کے حساب سے آواز نکالتی رہتی ہیں اور اسی آواز سے وہ بینائی کا کام بھی لیتی ہیں۔ ڈولفن کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔ اس کا تیل عضلات کے درد کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ سندھ ڈولفن 20 سال تک عمر پاتی ہے۔ ان ممالیہ جانوروں کا قدرتی ماحول میں دشمن صرف انسان ہے۔

آپ بھی لکھیے

زنگ آلود انسان

محمد تنویر جبار' شاہ جلیل

سر سلیم ہمیں "زنگ آلودگی" پر لیکچر دے رہے تھے۔ سر بتا رہے تھے کہ زنگ آلودگی ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی دھات آب و ہوا سے شروع ہونے والے کیمیائی عوامل سے تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

"کسی دھات پر زنگ کا لگ جانا ایک سست رو لیکن مسلسل عمل ہے۔ زنگ دھات کی عمر کو کم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ چاندی کی اشیاء مثلاً زیورات پر ایک سیاہ باریک تہ جم جاتی ہے۔ لوہے پر بھورے رنگ کا زنگ بھی آپ نے دیکھا ہی ہو گا"۔ سر نے لیکچر جاری رکھتے ہوئے بتایا "ساحلی اور زیادہ بارشوں والے علاقوں میں زنگ زیادہ لگتا ہے۔ ہوا کی آکسیجن دھاتوں سے مل کر کیمیائی عمل کرتی ہے۔ اس کیمیائی عمل کے بعد جو چیز بنتی ہے اسے ہم آکسائیڈ کہتے ہیں۔ زنگ کو روکنے کے لیے کئی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ برقی ملمع کاری ہے جس میں ایک زنگ کو قبول کرنے والی دھات پر برقی ملمع کاری سے ایک اور دھات جو زنگ کے خلاف مزاحمت رکھتی ہو' چڑھا دی جاتی ہے۔ طبعی طریقوں میں ہم اشیاء کو زنگ سے بچانے کے لیے رنگ اور روغن استعمال کرتے ہیں۔ مشینوں کے وہ پرزے جہاں رنگ نہیں کیا جا سکتا ان کو تیل یا گریس لگا کر زنگ سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے"۔

یہ سب کچھ سمجھانے کے بعد سر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے "بچو! لگتا ہے تم اکتا رہے ہو؟ یہ کیمسٹری مضمون ہی ایسا ہے۔ چلو آج کے لیکچر کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال آیا ہے تو پوچھیے"۔

"سر! میں تو لیکچر کے شروع ہی سے سوال کرنے کے لیے بے چین تھا" بلال نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ہاں ہاں' پوچھو بیٹا" سر نے کتاب سے نظر ہٹا کر عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر' ان دھاتوں کی طرح کیا انسان کو بھی زنگ لگتا ہے؟"

بلال نے سوال کیا پوچھ لیا ساری کلاس کھل کھلا کر ہنس دی۔ میں نے بھی بڑی مشکل سے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکی۔

"پیارے طالب علمو! انسان کو بھی زنگ لگتا ہے' انسان کو زنگ اس کے دل پر لگتا ہے"۔

سر اپنی بات جاری رکھنا چاہ رہے تھے لیکن پیچھے بیٹھے اسامہ نے ہاتھ کھڑا کر کے کچھ کہنے کی اجازت چاہی تو سر نے اجازت دے دی۔ اسامہ نے کہا "اسی دل کے زنگ کی وجہ سے آج کل لوگوں کو ہارٹ اٹیک اور بلڈ پریشر جیسی بیماریاں ہو رہی ہیں"۔

سر کہنے لگے "جی یہ درست ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ دل کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ آپؐ کے اس فرمان پر صحابہؓ کرام نے پوچھا "دلوں کے زنگ کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ یا زنگ کو دور کرنے والی کون سی چیز ہے؟"

آپؐ نے فرمایا "دلوں کا زنگ موت کو یاد کرنے اور

قرآن کی تلاوت کرنے سے دور ہوتا ہے"۔

ساری کلاس مکمل یک سوئی سے سر کی دل میں اتر جانے والی باتیں سن رہی تھی۔

"آج تم لوگ دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے اپنے دلوں کو خود ہی زنگ آلود کر لیا ہے۔ اگر موت کو یاد رکھیں تو کبھی بھی غلط کاموں میں نہ پڑیں۔ جس طرح آب و ہوا دھاتوں کو زنگ لگانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اسی طرح ہمارا ماحول بھی ہمارے دل کو زنگ آلود کر رہا ہے۔ فحش فلمیں اور گانے بجانے کے پروگرامات وغیرہ یہی تو وہ چیزیں ہیں جو ہمارے دلوں پر زنگ کی تہ جما دیتی ہیں"۔

اس سے پہلے کہ سر اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے' گھنٹی بج گئی اور ہم اگلے دن کا انتظار کرنے لگے (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

شرمناک واقعہ

ندا چودھری' اسلام آباد

میں اور میرے گھر والے کراچی سے بس میں سوار اپنے شہر آرہے تھے۔ راستے میں ہم نے انسانیت کی رسوائی کا عجیب منظر دیکھا اور بہت افسوس کا اظہار کیا۔

بس کراچی سے چل کر اندرون سندھ کے ایک علاقے میں رکی تو اس میں ایک وڈیرے صاحب اپنے نوکر کے ساتھ سوار ہوئے۔ کنڈکٹر نے دو خالی سیٹیں وڈیرے کے حوالے کر دیں۔ وڈیرا خوب پھیل کر دونوں سیٹوں پر بیٹھ گیا اور اس کا نوکر کھڑا رہا۔

کنڈکٹر قریب سے گزرا تو اس نے نوکر سے سیٹ پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ معصوم صورت کھڑا رہا۔ اس دوران میں وڈیرا مسکرا کر اپنی لمبی اور گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر تا رہا۔ قریب بیٹھے لوگوں نے نوکر سے کہا "کھڑے کیوں ہو؟ سیٹ خالی ہے بیٹھ جاؤ"۔

وڈیرا بولا "یہ کمی بھلا میرے برابر کیسے بیٹھے گا۔ چل اوئے! نیچے بیٹھ جاؤ"

وڈیرے کی بات سن کر ملازم نیچے بیٹھ گیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ اسے اپنے قریب کیوں نہیں بٹھا لیتے۔ وڈیرا اکڑ کر بولا "چپ رہو جی یہ کمی ہے۔ مر جائے گا لیکن میرے ساتھ بیٹھنے کی جرات نہیں کرے گا۔ ہم ان کمینوں کو سر پر نہیں چڑھاتے' ان کی جگہ ہمارے قدموں میں ہے۔ یہ یہیں بھلے لگتے ہیں"۔

وڈیرے کی بات سن کر ایک صاحب نے کہا "چلئے یہ آپ کے ساتھ نہیں بیٹھتا ہم اسے کسی دوسری سیٹ پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس سیٹ کا مسافر آپ کے ساتھ بیٹھ جائے گا"۔

ان صاحب کو وڈیرے نے گھور کر دیکھا اور بارعب آواز میں بولا "جس بات کا علم نہ ہو اس میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ میں جس بس میں سوار ہوں اس میں یہ کسی بھی سیٹ پر نہیں بیٹھے گا۔ آگے ہو یا پیچھے۔ تم اسے سیٹ دے کر دیکھ لو"۔

ہم نے ملازم کی منتیں کیں مگر وہ سیٹ پر نہ بیٹھا۔ وڈیرا! بڑی شان سے مسکرایا۔ اس نے اپنی وزنی ٹانگ ملازم کی گود میں رکھ دی اور وہ اسے دبانے لگا۔ یہ سلسلہ تمام راستے میں جاری رہا۔ بس رکتی تو وڈیرا کچھ نہ کچھ لے کر کھا لیتا مگر ملازم سر جھکائے ٹانگیں دبانے میں لگا رہتا۔

سکھر آیا تو وڈیرا نیچے اترنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مگر مسافروں کو بھی اترنے کی جلدی تھی۔ تمام مسافر بس کے دروازے کی طرف بڑھے۔ وڈیرے نے ملازم سے کہا۔ کنڈکٹر سے کہو کہ ذرا جلدی کرے"۔

ملازم دروازے کی طرف بڑھا تو وڈیرے نے اس کو دبوچ لیا اور اس کے منہ پر دو تین طمانچے رسید کر کے بولا "اوئے! کمی کی اولاد' میری طرف پیٹھ کرتا ہے!"

ملازم وڈیرے کی مار کھا کر پیچھے ہو گیا۔ جو مسافر وڈیرے کے آگے تھے انہوں نے پروا بھی نہیں کہ وڈیرے صاحب کو ان کی پیٹھ ہو رہی ہے۔ کیوں کہ وڈیرے کا زور صرف اپنے کمی پر چل سکتا تھا۔ بھلا ایسی جھوٹی شان بنانے کا کیا فائدہ کہ اپنے کمی تو گھٹنے ٹیک کر عزت کریں اور باقی لوگ

گھاس بھی نہ ڈالیں۔ انسانیت کی ذلت اور رسوائی کا یہ شرم ناک واقعہ آج بھی یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

اللہ میاں ہمارے بھی تو ہیں

فرحت فاروق' لاہور

"تمام حضرات کھڑے ہو جائیں۔ بچے پیچھے چلے جائیں' بڑے آگے آجائیں"۔

فاروق کو اس اعلان سے سخت چڑ تھی۔ فاروق بوجھل قدموں کے ساتھ پچھلی صف میں جا کھڑا ہوا اور جمعے کی نماز کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ ہی یہ سوچنے لگا کہ مولوی صاحب بچوں کو پچھلی صفوں میں جانے کے لیے کیوں کہتے ہیں۔ کیا اگلی صفوں پر صرف بڑوں ہی کا حق ہے۔ حال آں کہ اللہ تعالیٰ سے ہم نے بھی ویسے ہی دعا کرنی ہے جیسے بڑوں نے' پھر یہ فرق کیوں؟ اور تو اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ فاروق کے ہم عصر لڑکے' بڑے دھیان سے نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں اور انہیں ہاتھ سے پکڑ کر پچھلی صف میں دھکیل دیا جاتا ہے"۔

اس طرح کی نجانے کتنی سوچیں اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طریقے سے نماز بھی نہ پڑھ سکا۔ نماز ختم ہونے کے بعد وہ دوستوں اور محلے داروں سے بات کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا گھر پہنچا اور سیدھا اپنی امی کے پاس گیا۔

"امی مولوی صاحب آخر ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں؟" فاروق نے کہا۔

امی جان کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ نماز شروع ہوتے ہی وہ بچوں کو پیچھے جانے کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ اتنی دیر میں ابو گھر میں داخل ہوئے۔ وہ بھی نماز پڑھ کر لوٹے تھے۔ امی نے کہا "لو تمہارے ابو آگئے۔ یہ سوال انہیں سے پوچھو' میں کھانا لگاتی ہوں"۔

کھانے کے دوران میں جب اس نے اپنا مسئلہ ابو کے سامنے پیش کیا تو وہ کچھ سوچ کر بولے "بڑے بچوں کے مقابلے میں معزز سمجھے جاتے ہیں"۔

ان کی بات اس کے دل کو نہ لگی۔ وہ کہنے لگا "لیکن اسلام تو ہمیں مساوات کا سبق دیتا ہے۔ نماز جیسی عبادت میں تو مساوات کا خاصا عمل دخل ہے۔ دیکھیں نا ہمارے قومی شاعر نے بھی کہا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا' نہ کوئی بندہ نواز

اور ابو آپ کو تو معلوم ہے کہ میں شرارتیں نہیں کرتا۔ مولوی صاحب سمیت تمام نمازی مجھے روزانہ مسجد میں نماز پڑھتا دیکھتے ہیں پھر وہ مجھ سے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں؟ جیسے میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں"۔

جب فاروق اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے ابو نے اس کی باتوں کو سراہا ہے۔ اگلے دن اس نے دیکھا کہ ابو مولوی صاحب سے بات کر رہے تھے اور مولوی صاحب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آج ان کی آنکھوں میں سختی کے بجائے پیار و محبت تھا (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

اے وطن

عدنان رمضان' لاہور

تیری بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کا لہو ڈال کر میں نے تیری اس مقدس عمارت کو تعمیر کیا ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ میں تیری تلاش میں پھرتا رہا۔ ہزاروں خزاؤں نے میرے گل ہائے امید و حسرت کو خاکستر کیا۔ لاکھوں بہاریں آئیں لیکن میری خواہشوں اور حسرتوں کی کلیاں بن کھلے مرجھا گئیں۔ مخالفتوں' نفرتوں' منافقتوں کے تھپیڑے سہتا رہا لیکن میں تیری تلاش میں راہ وفا پر گامزن رہا۔ اگرچہ اس راہ میں دھوپ ہی دھوپ تھی اور سائے کم تھے لیکن

تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس راہ پر چلنے والے ہمیشہ خوش ہی رہے ہیں پچھتائے نہیں۔ آخر کار کشتی امید کنارے لگتی نظر آئی اور ایک ایسا رہبر اور ہادی مل گیا جس کی ہر ٹھوکر سے ایک نئی راہ تشکیل ہوتی تھی۔ بظاہر نحیف و نزار' لاغر' ہڈیوں کا ڈھانچہ' لمبا تڑنگا لیکن عزم کا کوہ گراں' فہم و فراست کی دنیا کا بادشاہ اور سیاست عالم کے لیے ایک روشن مثال محمد علی جناح کہ جس کے نام پر بھی رب کا سایہ ہے۔

اے ارض وطن! وہ میرا قائد' آگے بڑھا۔ تیرا چپہ چپہ اس کی کوششوں کا گواہ ہے۔ ہزاروں بچوں کے بے گناہ لاشے تڑپے اور تیری ممتا کو سکون بخشا۔ لاکھوں بیٹیوں نے اپنی عزت تیری عصمت پر قربان کر دی۔ لاکھوں ماؤں کی قربانیاں تیری مانگ کا سندور بنیں۔ لاکھوں جوانوں کا لہو تیری بنیادوں کو رنگین کر گیا۔

اے مادر وطن! میرا تیرا رشتہ بھی بالکل انوکھا اور نرالا ہے۔ مائیں بچوں کو جنم دیتی ہیں لیکن تجھے میں نے جنم دیا ہے۔ مائیں بچوں کو دودھ پلا کر جوان کرتی ہیں میں نے تجھے اپنا خون پلا کر جوان کیا ہے۔ مائیں بچوں کو سینے سے چمٹائے رکھتی ہیں اور ان کے بوسے لیتی ہیں۔ میں تیری یادوں کی بارات ہر دم سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ مجھے تیرے چپے چپے سے پیار ہے۔ تو میری جان ہے۔ تیرے پہاڑ جاں فزا' تیرا موسم خوش نما' تیرے لہکتے ہوئے سر سبز جنگل' تیرے مہکتے باغوں کے منظر اور تیری فضاؤں میں بکھری ہوئی خوب صورت گھٹائیں' میرے انگ انگ میں رس گھولتی ہیں۔ صرف اس لیے کہ تیری بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کے ساتھ میرا لہو بھی شامل ہے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

ملکہ کہسار کی سیر

صبا شفیق' فیصل آباد

اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے ملکہ کہسار' مری کی سیر کا پروگرام بنایا۔ 5 اگست کو صبح تقریباً 7 بجے ہم اپنی گاڑی میں فیصل آباد سے روانہ ہوئے۔ بذریعہ موٹروے ہم اسلام آباد پہنچے۔ ایک دن اسلام آباد میں قیام کیا اور فیصل مسجد' دامن کوہ اور شکر پڑیاں وغیرہ کی سیر کی۔

اگلے دن ہم مری روڈ پر مری جانے کے لیے گامزن ہوئے۔ راستے میں ہم نے چھتر پارک کی سیر بھی کی پھر ہم چھرہ پانی پر رکے۔ ابو نے بتایا کہ چوں کہ اس مقام یعنی چھرہ پانی کے بعد چڑھائی زیادہ ہو جاتی ہے اس لیے گاڑی کے انجن کو گرم ہونے سے بچانے کے لیے یہاں پر رک کر گاڑیوں میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ابو نے یہ بھی بتایا کہ یہ مقام ایک قسم کا پہاڑی چشمہ ہے جس میں سال کے بارہ مہینے پانی بہتا رہتا ہے۔

راستے میں چیڑ اور دیودار کے بے شمار درخت تھے۔ تقریباً سوا گھنٹے کے سفر کے بعد ہم مری پہنچے۔ مری کی سب سے مشہور شاہراہ مال روڈ جسے جناح روڈ بھی کہا جاتا ہے پر موجود ایک ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا۔ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہم مال روڈ کی سیر کرنے کے لیے ہوٹل سے نکلے۔ ابو نے بتایا کہ یہ مری کی سب سے مشہور شاہراہ ہے اور یہاں پر موجود بازار مری کا اہم ترین بازار ہے۔

اگلے دن ہم کشمیر پوائنٹ کی طرف گئے۔ ابو نے بتایا کہ اس جگہ کو کشمیر پوائنٹ اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ اس مقام کا رخ کشمیر کی جانب ہے اور یہاں سے کشمیر کی پہاڑیاں بھی نظر آتی ہیں۔

کشمیر پوائنٹ کی سیر کے بعد ہم پنڈی پوائنٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام راستہ صنوبر کے خوب صورت درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پنڈی پوائنٹ کی سب سے خوب صورت چیز چیئر لفٹ تھی۔ ہم سب چیئر لفٹ پر بیٹھے۔ جس جگہ چیئر لفٹ کا خوب صورت سفر ختم ہوا اس سے آگے ہم کیبل کار پر بیٹھ کر پتریاٹہ گئے۔ پتریاٹہ کو نیو مری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی نہایت خوب صورت جگہ تھی اور اس جگہ کا حسن دیکھ کر ہم بے اختیار سبحان اللہ کہہ اٹھے۔ پتریاٹہ میں جگہ جگہ اسٹابری اور رس بھری کے پودے تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا پتریاٹہ میں

کھایااور واپس مری آگئے۔

اگلے روز موسم نہایت خوش گوار ہو گیا۔ بادل پہاڑوں پر ادھر سے ادھر دوڑنے لگے۔ ہم تو پہلے ہی فیصل آباد کی آگ لگاتی گرمی سے مری کے خوش گوار موسم میں آکر بہت خوش تھے۔ بادلوں نے مری کے حسن کو اور دوبالا کر دیااور ہم ملکہ کہسار کے قیامت خیز حسن سے جی بھر کر لطف اندوز ہوئے۔ آخر کار پانچویں دن ابو نے واپسی کا الٹی میٹم دیا اور ہم سب دلوں میں مری میں گزارے ہوئے خوش گوار دنوں کی یادیں لیے واپس گھر آگئے (پانچواں انعام:60روپے کی کتابیں)

ایک نہیں گیارہ مریں

محمد ارشد فیروزدین جنجوعہ 'سیال کوٹ

آج شب برات تھی۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ نوید' علی اور عثمان اپنے دادا ابو کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھے تھے۔ دادا ابو نے تینوں کو دس دس روپے دیئے اور کہا کہ باری باری تم تینوں بازار جاؤ اور اپنے اپنے روپوں کو استعمال میں لاؤ۔ وہ مزید بولے کہ جو بھی اپنے روپوں کا صحیح استعمال کرے گا میں اسے مزید انعام کے طور پر ایک سو روپے دوں گا۔

سب سے پہلے بڑا بھائی نوید بازار گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ دادا جان کے پوچھنے پر کہ اس میں کیا ہے' وہ بولا "پیارے دادا جان! چوں کہ آج شب برات ہے اس لیے میں نے دس روپوں کے پٹاخے خریدے ہیں" دادا جان بالکل خاموش رہے۔ اب انہوں نے علی کو جانے کا اشارہ کیا۔

علی اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹا بعد وہ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک لفافہ تھا۔ دادا جان کے پوچھنے پر اس نے کہا" دادا جان میں جو چیز لایا ہوں آپ اسے دیکھ کر یقیناً مجھے انعام کا حق دار سمجھیں گے"۔

اس کے بعد اس نے لفافے میں سے اپنی چیز نکالی۔ یہ موم بتیوں کا ایک پیکٹ تھا۔ دادا جان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ علی نے مزید بتایا" دادا جان' پٹاخے کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں مگر موم بتیاں بے ضرر ہوتی ہیں"۔

اب دادا جان نے عثمان کو جانے کے لیے کہا۔

عثمان بھی فوراً باہر کی طرف چل دیا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ واپس آیا۔ دادا جان سمیت دونوں بچوں کی حیرت کی انتہا نہ تھی کیوں کہ عثمان خالی ہاتھ تھا۔ دادا جان حیرت سے بولے "کیا بازار بند ہو چکے ہیں یا کسی نے تمہارے روپے چھین لیے ہیں؟"

عثمان نے نفی میں سر ہلایا اور بولا "ان دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب میں بازار پہنچا تو ایک طرف ہمارے کشمیری مجاہدین کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی دس روپے دے تو اس سے ہم ایک گولی خریدیں گے اور اس سے دشمن کا ایک آدمی ماریں گے۔ میں یہ بات سن کر بہت بے چین ہوا اور میں نے اپنے دس روپے ان کو جمع کروا دیئے"۔

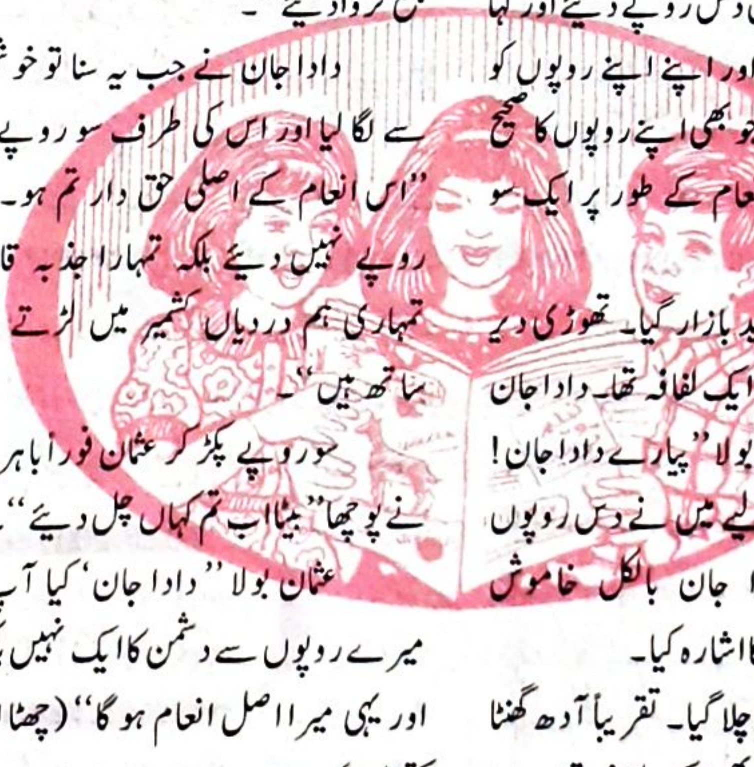

دادا جان نے جب یہ سنا تو خوشی سے عثمان کو گلے سے لگا لیا اور اس کی طرف سو روپے بڑھاتے ہوئے کہا "اس انعام کے اصلی حق دار تم ہو۔ تم نے صرف دس روپے نہیں دیئے بلکہ تمہارا جذبہ قابل تعریف ہے کہ تمہاری ہم دردیاں کشمیر میں لڑتے ہوئے مجاہدین کے ساتھ ہیں"۔

سو روپے پکڑ کر عثمان فوراً باہر جانے لگا۔ دادا جان نے پوچھا "بیٹا اب تم کہاں چل دیئے"۔

عثمان بولا "دادا جان' کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ میرے روپوں سے دشمن کا ایک نہیں بلکہ گیارہ آدمی مریں اور یہی میرا اصل انعام ہو گا" (چھٹا انعام: 50روپے کی کتابیں)

***

سردی کا موسم

افضال عاجز

پھر سرما کا موسم آیا
پھر سب کو اس نے ٹھٹھرایا
پھر نکلے کمبل دو شالے
تھر تھر کانپے سب گھر والے
تیز چلیں ہیں سرد ہوائیں
دھوپ کی کرنیں من کو بھائیں
دور چلے گا پھر چائے کا
ناشتا ہو گا اب پائے کا
ابا ذرا بازار تو جائیں
چلغوزے بادام تو لائیں
اس موسم کے کیا ہیں کہنے
کوٹ سوئٹر سب نے پہنے

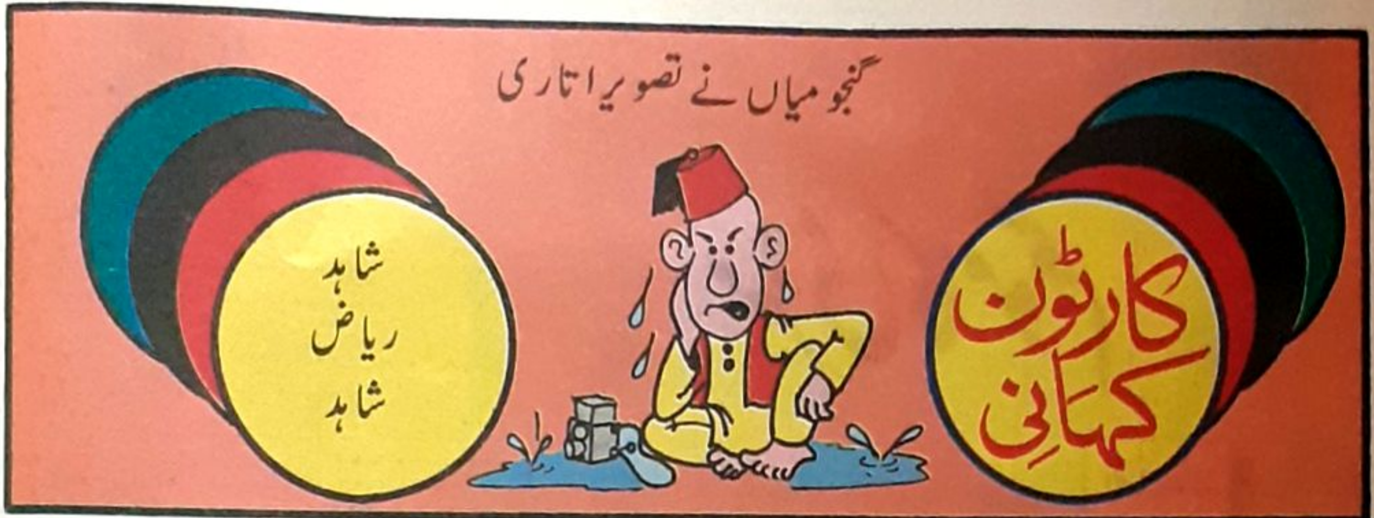
گنجو میاں نے تصویر اتاری
کارٹون کہانی
شاہد
ریاض
شاہد

سردی کا موسم تھا گنجو میاں کیمرا لے کر چلڈرن پارک کے سوئمنگ پول کے پاس کھڑے کچھ سوچ رہے تھے
کاش! کوئی دوست آجائے...... اور اس کی میں اس حسین جگہ پر تصویر اتاروں

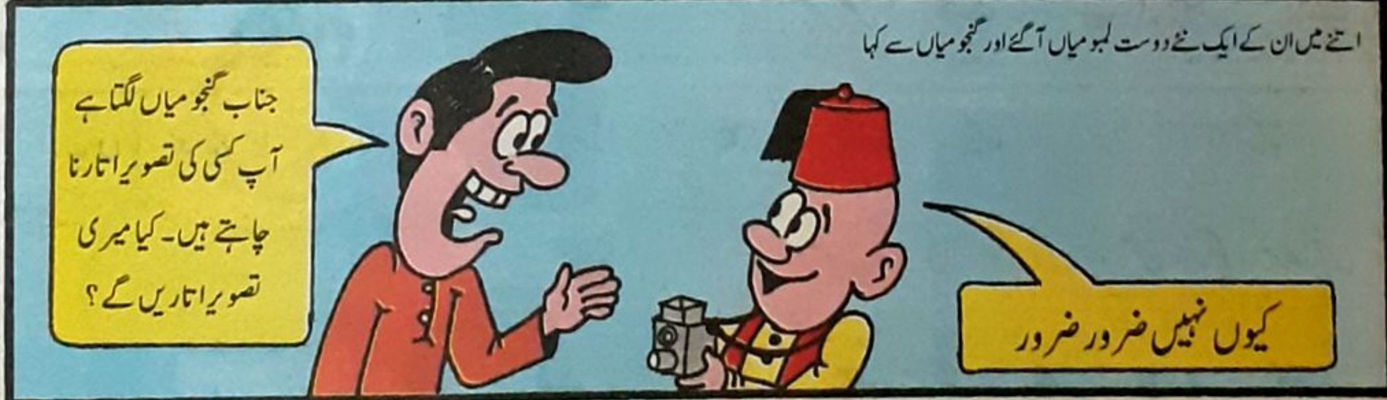
اتنے میں ان کے ایک نئے دوست لمبو میاں آگئے اور گنجو میاں سے کہا
جناب گنجو میاں لگتا ہے آپ کسی کی تصویر اتارنا چاہتے ہیں۔ کیا میری تصویر اتاریں گے؟
کیوں نہیں ضرور ضرور

پھر لمبو میاں ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور گنجو میاں تصویر اتارنے لگے
نہیں بھئی، ہمیں اور لاؤ تصویر میں
لمبو جی آپ کا صرف سر اور کندھے ہی کیمرے میں نظر آرہے ہیں

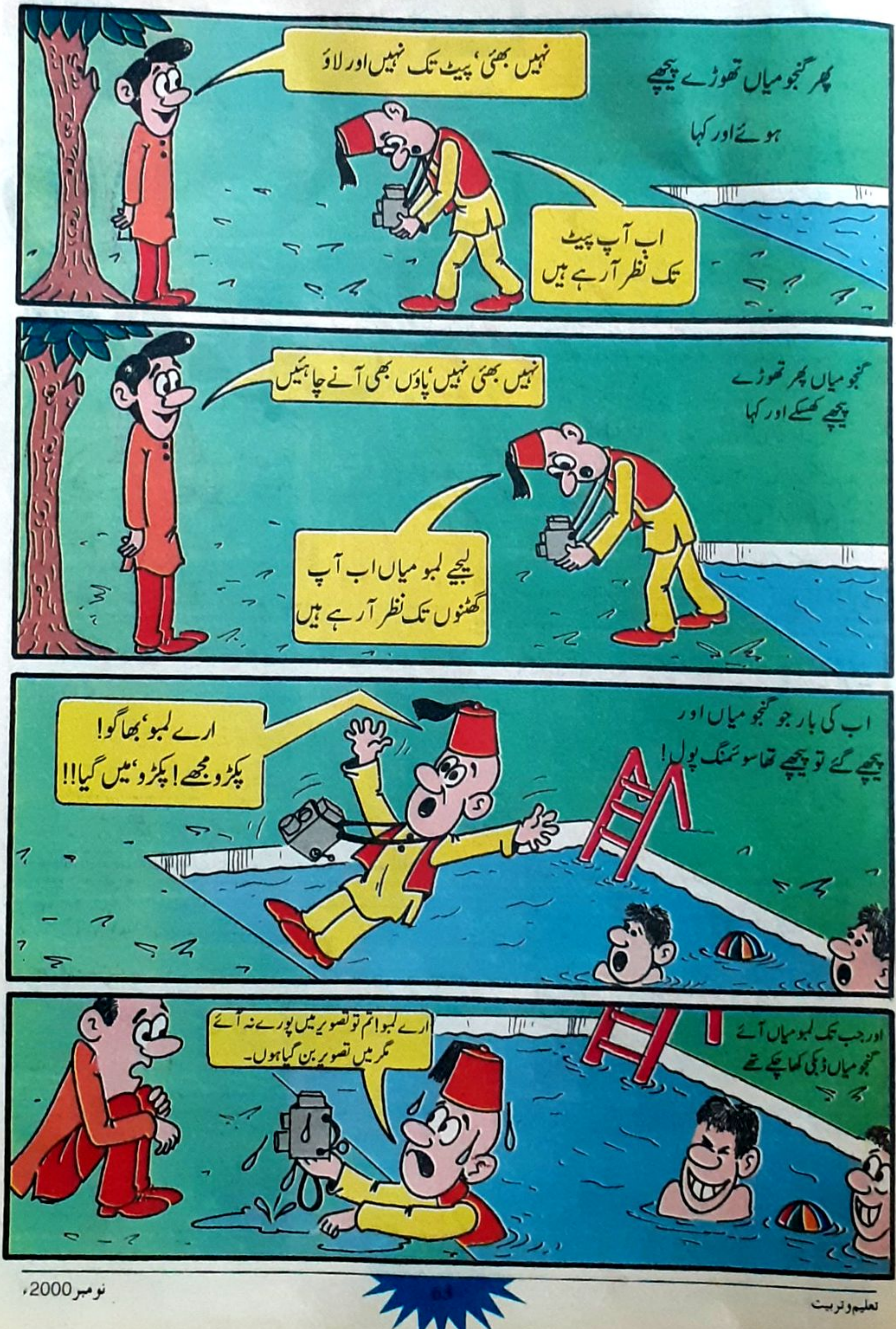
پھر گنجو میاں تھوڑے پیچھے
ہوئے اور کہا
اب آپ پیٹ
تک نظر آرہے ہیں
نہیں بھئی، پیٹ تک نہیں اور لاؤ
گنجو میاں پھر تھوڑے
پیچھے کھسکے اور کہا
لیجیے لمبو میاں اب آپ
گھٹنوں تک نظر آرہے ہیں
نہیں بھئی نہیں، پاؤں بھی آنے چاہئیں
اب کی بار جو گنجو میاں اور
پیچھے گئے تو پیچھے تھا سوئمنگ پول!
ارے لمبو، بھاگو!
پکڑو مجھے! پکڑو، میں گیا!!
اور جب تک لمبو میاں آئے
گنجو میاں ڈبکی کھا چکے تھے
ارے لمبو! تم تو تصویر میں پورے نہ آئے
مگر میں تصویر بن گیا ہوں۔

بھیجنے کی آخری تاریخ 7 نومبر 2000ء

بلاعنوان

اکتوبر 2000ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ محمد آصف 'واہ چھاؤنی (ہمارا حصہ بھی نکالو ورنہ اپنا خیمہ خود سنبھالو، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ حافظ منیب احمد طلحہ 'لاہور (خیمہ بگلوں کا شکار مچھلیوں کا' دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ منعم علی 'گوجرانوالہ (دیکھیں اب مچھلی کون پکڑتا ہے' تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ تحسین احمد 'میرپور خاص (ہماری آفت تمہاری ضیافت' چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ عائشہ سعید 'اٹک (لمبی ٹانگوں کے لمبے فائدے' پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ داہیم محمود 'جہلم (چلتا پھرتا خیمہ' چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)